

یادِ ولودِ غالب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ اے آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

يَا ذُو الْبُودِ غَالِبَ

یادِ ولُّودِ غالب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ اے۔ آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

Yad-o-Bod-e-Ghalib

By : Khwaja Ahmad Faruqi

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت :

پہلا ایڈیشن : 1993

دوسرا ایڈیشن : 2003 تعداد 1100

قیمت : 53/=

سلسلہ مطبوعات : 688

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداواد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدایار سیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسار کھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کررار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقہ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کو نسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلنیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

۹	غالب کی عظمت	-۱ ۱
۱۷	غالب اور بے مبر	-۱ ۲
۲۸	غالب اور آزرده	-۱ ۳
۳۷	غالب کی شخصیت اور شاعری	-۱ ۴
	میں	
	ترکی، ایرانی عناصر	
۵۶	غالب کا مقدمہ پنشن	-۱ ۵
۷۱	غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات	-۱ ۶
	حضرت غمگین کے ساتھ	
۸۱	غالب کا سگہ شعر	-۱ ۷
۹۶	معرکہ غالب و حامیان قتیل	-۱ ۸
	ایرانی، ہندی نزاع کی روشنی میں	
۱۱۵	غالب کی دلی	-۱ ۹

غالب کی عظمت

آج کا دن ہماری تاریخ ادب میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، اس روز قلم سخن کے تاجدار مرزا اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہی نہیں ہوا، بلکہ پورے ایک دور، ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ دور عبارت ہے فیضی اور رحیم کی شاعری سے، عبدالصمد کی مصوری سے اور سیمکری اور تاج محل کی صناعت اور خوبصورتی سے، مرزا غالب اس محفل کی آخری شمع تھے، لیکن وہ ایک دور کے خاتمہ ہی نہیں، ایک نئے دور کے پیش رو بھی ہیں۔ ادب میں جو نئی بنیادیں انھوں نے قائم کیں، جدید نثر اور جدید شاعری کا ایوانِ رفیع اسی پر تیار کیا گیا ہے۔

مرزا غالب نے جس وقت بوش کی آنکھ کھولی، مغلیہ سلطنت کی شمع ٹپتا رہی تھی؛ لارڈ لیک کی فوجیں دہلی تک پہنچ گئی تھیں، انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا اور شہنشاہِ عالم اور عالمیان کی حکومت قلعہ معلیٰ تک رہ گئی تھی، پرانا نظام کمزور اور بے دست ہو گیا تھا اور نئے کی گرفت دن بدن مضبوط ہوتی جاتی تھی، لیکن ابھی قدیم نظام حیات کی دلکشی کم نہ ہوئی تھی بلکہ تبدیل شدہ حالات نے اس محبت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ آویزش اور پیکار تھا جو اسماعیل شہید سے شروع ہو کر غدر پر ختم ہوا، غدر سے مرزا غالب کی وفات تک پرانا نظام حیات درہم برہم تو ہوتا رہا لیکن نیا وجود میں نہیں آیا، پرانی قدیم مضحک ہو کر ختم تو ہونے لگیں لیکن نئی

وجود میں نہیں آئیں، اس وقت نقشِ جاوہر پیدا تھا اور زندگی منزل و محل سے بے نیاز تھی۔

اس شکست اور اضطراب کے زمانے میں جب موجِ خوں ہمارے سر سے گزر رہی تھی، مرزا غالب نے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کیا انھوں نے زندگی کی تکلیفوں پر رنجیدہ ہونے کے بجائے اس کا ایک حوصلہ اور ایک ہمت عطا کی، انھوں نے تیرگیِ شام کو نورِ سحر قرار دیا اور اس طرح ہمیں ظلمت کے برداشت کرنے کا اہل بنا دیا۔

غالب کی پرورش نہایت شاندار ماحول میں ہوئی تھی، جہاں عیشِ امروز کے سارے وسائل و ذرائع موجود تھے یعنی شاہد و شمع و سہ و قمار، لیکن یہ فضا مادی ترقیوں کے لیے سازگار نہیں تھی، اب سرشکری کا موقع نہیں تھا، صرف سخن گسری کا موقع تھا، اس لیے انھوں نے اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لیے شعر و سخن کا راستہ اختیار کیا جس کا ذوق وہ ازل سے لائے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں ”آئینہ زد و دون صورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است“ یہی وجہ ہے کہ تورانیوں کا علم ان کے قلم میں تبدیل ہو گیا ہے، اس قلم میں تلوار کی سی تیزی اور برش بھی آگئی ہے جس سے آزادی اور جرات کے ساتھ مولانا اسماعیل شہید نے اپنی اصلاحی تحریک شروع کی تھی، اور رسوم و معاشرت میں تقلید کی بُرائی، اسی آزادی کے ساتھ غالب نے فنِ نعت اور فنِ شعر گوئی میں استادوں پر آزادانہ نکتہ چینی کی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ”ہر پرانی لکیر صراطِ مستقیم نہیں ہے“ اور اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں، وہ پوری طرح سنا نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب نے شعر و ادب میں ماضی کے سرمایے سے قطع نظر نہیں کیا، حال کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا اور مستقبل کے لیے وسعت پیدا کی۔ عبدالحق صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ اگر غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔ یونان کے دیوتا کی طرح ان کا ایک رخ ماضی کی طرف ہے اور دوسرا مستقبل کی طرف۔ غالب غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے، ان کی عظمت کا راز ان کی رنگارنگی، ان کی دلکش انفرادیت، ان کی انسان دوستی اور ان کی آفاقیت میں پوشیدہ ہے۔ وہ

بڑے شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک بھر پور انسان تھے، جس میں بتقاضائے بشریت خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی، انھوں نے کبھی اپنی شخصیت پر تہ بہ تہ نقاب نہیں ڈالے اور پردے کے نقش و نگار کو حقیقت باور نہیں کرایا، وہ جیسے ہیں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں، یہی بیدار صداقت، جذب زندگی اور سنجیدہ ظرافت اردو ادب کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ انھوں نے نئے نظام اور نئے زمانے کی اس وقت تائید کی جب سرسید کو بھی اس کی جرأت نہیں تھی، انھوں نے قتیل، برہان قاطع اور نواب کلب علی خاں کے جوابات اسی طرح دیے، جس طرح ترک اور تورانی لڑتے ہیں، کسی جگہ انھوں نے اپنی انفرادیت کو مجرد روح ہونے نہیں دیا۔

اس پُر آشوب زمانے میں خود مرزا کی زندگی بڑی پُر آشوب گزری، وہ اگرہ کے غم کدہ دنیا سے نکل کر دی آئے تو یہاں شاعر در، سے معزہ آرا ہوئے، انھوں نے ذوق کی لسانی، تحریک کو مانا لیکن اس کو ٹھیکمانہ نظر بھی دی۔ کلکتہ گئے تو وہاں قتیل کے حلقہ بگوشوں سے برسرِ پیکار ہوئے اور اس ایرانی ہندی نزاع میں کود پڑے جو فیتسی اور عرفی، اور شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے زمانے سے جاری تھی، مرزا نے اس میں بھی سرگرم حصہ لیا اور بعض ایرانیوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ پھر ان کی پینشن کا قصہ اٹھ کھڑا ہوا جس میں تیس برس تک الجھے رہے۔ یہ صرف زندگی کا معاملہ نہیں تھا، خاندانی حق اور وجاہت کا بھی سوال تھا۔ انھوں نے انگریزوں کی خدمت میں عرضیاں بھیجیں اور حکام کو خوش کرنے کی بیش از بیش کوشش کی لیکن یہاں بھی سوال ثنا گوئی اور مدح گستری سے زیادہ "جیفہ دسرتیچ و مالاسے مردارید" کا تھا یا دربارِ لمبر اور خلافت کا۔

اس وقت وہ تمام روشنیاں جن سے ظلمت کدہ حیات میں روشنی تھی، ایک ایک کر کے گل ہو رہی تھیں، وہ تمام قدیں جو مرزا کو بے حد عزیز تھیں ایک ایک کر کے منہدم اور مسمار ہو رہی تھیں لیکن ان کے کلام میں فریاد اور بغاوت پیدا نہیں ہو سکی، اور یہ ادنیٰ بات نہیں ہے۔ اگر گلشنِ ہند کی روایتِ صحیح ہے تو میر تقی میر کو تین سو پچھپے ماہوار ملتے رہے، لیکن مرزا غالب کی "ذاتی امارت" ہمیشہ ایک اختلافی مسئلہ رہی اور جب

اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کا وقت آیا تو اس کی "مالیت" باسٹھ روپیہ آٹھ آنے سے زیادہ نہ نکلی، اس کے باوجود ان کے کلام میں وہ "کلبیت اور مرثیت" پیدا نہ ہو سکی کہ وہ آہ جگر گداز اور نالہ دل خراش کو حاصل زندگی سمجھنے لگتے۔

مرزا کی شخصیت میں جو چیز غیر معمولی کشش اور دلآویزی رکھتی ہے وہ ان کی بشریت ہے اور اس پر فخر و ناز ہے۔ ان کے کلام میں عام انسانی مسائل اور الجھنوں کا بیان ہے اور انہیں اس کے اظہار میں مطلقاً پاک نہیں تھا کہ وہ عام انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں تھے۔ اگر آم نے سردالترالے کا ایک قول شکیبائے متعلق نقل کیا ہے "وہ کم یاب ترین چیز تھا، یعنی ایک پورا انسان" غالب بھی کہتے ہیں:

خوئے آدم دارم، آدم زادہ دارم

سعدی کی طرح ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی مبوش مندی اور دنیا داری ہے جو اس دنیا کے بسنے والوں کو بہت عزیز ہے۔ اس آئینہ میں وہ اپنے ہی خط و خال دیکھتے ہیں اور ان کے دل کی داستانیں ان کو اپنی ہی سرگذشت کا لطف ملتا ہے۔ غالب کی شخصیت صرف پر شکوہ اور لائق احترام ہی نہیں بلکہ وہ ہمارے "ادب کی سب سے خوش صحبت ہستی" ہے، آپ جس رنگ اور لباس میں بھی وہاں جائیں گے وہ آپ کو پہچان لے گی، آپ کے درد دل سے واقف ہوگی اور آپ کو تسکین اور آسودگی کا سامان بہم پہنچائے گی۔ اسی لیے جبوری نے لکھا تھا کہ لوح سے تمت تک شکل سے تاوصفے ہیں لیکن کون سا نغمہ ہے جو یہاں نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف مرزا کی رنگارنگی اور بولبولوں کی شخصیت ہے۔

بعض نقادوں نے مرزا کو ولی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے شیطان، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف ایک انسان تھا جو بشری کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالنا بلکہ انچونے نایم ستم کا فائل ہے۔

غالب سے پہلے آزاد و شاعری کے پاس جذبات تھے، احساسات تھے، زبان و بیان کے کوشش تھے لیکن وہ جیسے اندر خوش ذہانت نہیں تھی جو بکبر الفاظ میں روح چھونک

دینے ہے، یہ مرزا کا عطیہ ہے اور اس پر اردو بتانا بھی فخر کرے، کم ہے۔ وہ اپنے قدیم سرمایے سے واقف تھے لیکن اس کی ہر رسم اور فید کے پابند نہیں تھے، اسی لیے ان کی شاعری، افسوں و افسانہ نہیں ہے۔ اس میں افسانہ گیم کی آمیزش ہے، خون جگر کی نمو ہے۔ انھوں نے ہمیں نئے نئے خیالات دیئے، ان کے ادا کرنے کا ایسا نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز، اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور۔ اس میں مغل مسلم کی شکستگی ہے، اس کا پر معنی اختصار ہے، اس کا ترکا نہ بالکین ہے۔ یہ انداز و اسلوب حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے۔ غالب نے غزل اور قصیدے کی خارجی قبا دہی رکھی ہے جو پہلے تھی لیکن ان میں ایک اندرونی انقلاب ضرور پیدا کر دیا ہے۔ ناسخ و نصیر کی دنیا ان تبدیلیوں کی اہمیت کو اچھی طرح نہ سمجھ پائی اور غالب کو یہ کہنا پڑا :

مرے دعوے پر یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں!

غالب نے نظریہ حسن و عشق کی تعمیر میں ان کی وراثت، ان کی شخصیت اور ان کے نسل و خاندان کو بڑا دخل ہے۔ وہ محبوب کے وصل کو بہارِ تماشائے گلستانِ حیات سمجھتے ہیں اور بابر کی طرح عیشِ امروزی کو "زندگی" کے لیے ضروری۔ انھوں نے جن سچائیوں کا ذکر کیا ہے وہ ذہنی تجربہ نہیں بلکہ تجربہ اور جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث مجازی مادی اور انسانی ہیں۔

غالب کی سیرت اور ان کا کردار مثالی نہیں ہے، ان میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن یہ خامیاں زیادہ تر ان کے طبقے اور ان کے زمانے کی خامیاں ہیں، تاہم ان کی ذکاوت کا یہ کمال معمولی نہیں ہے کہ وہ اپنے ماحول کی خرابیوں سے باخبر نہیں تھے اور تخریب کے بعد تعمیر ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں جو مغربی تمدن کی برکتوں کا احساس اور انگریزوں کے علم و آئین اور داد و دانش کی تعریف ملتی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے طبقے اور ماحول سے بلند ہو کر بھی معاملات پر نظر ڈال سکتے تھے۔ غالب نے کلاسیک میں قیام کیا تھا جو اس وقت نئی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ اگر کہے کے بعد دہلی ان کا وطن تھا جس کو پرانی تہذیب کی علامت کہنا چاہیے لیکن یہاں قدیم دہلی کالج نے سائنسی علوم

کو اہمیت دے کر ایک نئی شمش جہت پیدا کر دی تھی۔ غالب کے ذہن کے نقش و نگار دراصل ان ہی دونوں جگہوں سے متعار ہیں۔

مرزا غالب نے اردو شاعری ہی کو نیا رنگ دیا، ہنگ نہیں دیا، جدید اردو شاعری بنیاد بھی اپنے بابرکت ہاتھوں سے قائم کی۔ ان کے خطوں میں، ان کی شخصیت اور روح عصر پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ وہی گفتگی، بلند نظری اور تابناکی جو ان کی شاعری کی خصوصیت ہے، یہاں بھی کارفرما ہے۔ جس طرح ان کی غزل حدیثِ دلبران سے گذر کر حدیثِ زندگی بن گئی ہے، ایسے ہی ان کے خطوں میں زندگی کا سونا پچھلا تاہوا نظر آتا ہے۔

مرزا اپنا راستہ خود طے کرتے ہیں۔ ان کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ خضر کی بھی پیروی کو وہ غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض وادیوں میں جہاں ان کے پاؤں چلتے چلتے جواب دے گئے ہیں، وہ سینے کے بل راستہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رسم و رواج اور تقلید کے پابند نہیں ہیں، شیخ و برہمن ان کی نظر میں ایک ہیں، ان کے یہاں "اسل جیز عقیدے سے وفاداری ہے، لکٹیں اہم نہیں ہیں، ان کے مٹنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے۔" ان کی انسانیت کے دائرے میں دیور حرم اور زنا و نسج کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہی نے خطوں میں بھی ہے "میں تو بھنی آدم کو، مسلمان یا ہندو، یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں" ان کے دوستوں میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی، کشانہ دل کے ماہ و دوہفتہ، مرزا تفتہ اور نور چشم میر محمدی اور انگریز بھی، جن میں کوئی ان کا امیدہ گاہ تھا، کوئی دوست، کوئی یار اور کوئی شاگرد۔

مرزا کا زندگی سے واسطہ براہ راست تھا، وہ دو برس کے تھے کہ باپ نے مرزا کا زندگی سے واسطہ براہ راست تھا۔ وہ دو برس کے تھے کہ باپ نے وفات پائی۔ پانچ سال کے ہوئے تو عجم بزرگوار نے انتقال کیا۔ اس کے بعد ان کو بے شک عشرت و میل میسر آیا لیکن اس کی ان کو قیمت بھی ادا کرنی پڑی، قرض خواہوں سے کبھی ان کو رہائی نہیں ملی، زندگی کے بہترین سال انھوں نے جاگیر کی تلگ و دود میں گزار دیئے۔ ان کے بھائی مرزا یوسف پاگل ہو گئے، پچاس برس کی عمر میں خود جیل خانے گئے۔ ہزار امانوں کے بعد اسادشہ مقرر ہوئے تو وہی سالی میں نہ وہ قدح باقی رہا اور نہ وہ ساقی، لیکن ان

حوادث کو وہ اپنے دریائے بے ابی کی ایک موجِ خوں سمجھ کر برداشت کرنے رہے۔ اس کھیل کو انھوں نے بازو چمکے اطفال سمجھا اور اپنی شائستہ طرافت اور شگفتہ متانت سے زندگی کو سنبھالا بھی اور سنوارا بھی۔

پریشانیوں اور مصیبتوں میں خود بہنا اور دوسرے کو بہنا آسان نہیں ہے۔ یہ بے نیاز اندہ خوش طبعی اور علمی روایتِ خطوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مرزا آفتہ کو لکھتے ہیں:

”مجھ کو دیکھو، نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ، جیے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں، جب موت آئے گی، مر رہوں گا، نہ شکر ہے نہ شکایت، جو تقرر رہے بر سبیلِ حکایت۔“

مرزا حاتم علی تہر کو تعزیت کا خط لکھتے ہیں۔ کیا نازک موقع ہے لیکن دیکھیے:

”مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں، کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک افشانی اور کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکوہ بجالاؤ اور غم نہ کھاؤ۔ میں جب بہشت کا خیال کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک نخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس خیال سے جی گھبراتا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمریں کلخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور، وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ۔“

مرزا غافلِ ایک ایک جملہ خیال انگیز ہے مرقع نگاری میں ان کو کمال حاصل ہے۔ یہ انداز ظہوری و بیدل یا معتمدین اور جب علی بیگ سمرقند سے مختلف ہے۔

”پانچ لشکر کا حملہ ہے بپے اس شہر پر ہوا، پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار تھا، دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں آسمان و زمین و آتارِ ہستی سراسر ٹٹ گئے.....“

مرزا آفتہ کو لکھتے ہیں:

”تم نے روپیہ بھی کھویا“ اور اپنی نیکو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا، ہائے کیا بڑی کا پی ہے اپنے اشعار کی، اور اس کا پی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ یہاں ہوتے اور نیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے، صورت ماہ دو ہفتہ کی سی، اور کپڑے میلے، پانچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی، یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف ”سنبلستان“ ایک معشوق خوب رو ہے لیکن بد لباس“ ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو :

”پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کو شکوہ گزار پایا ہے، بس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے، بلکہ یہ غم تو نصیب دوستان درخور اسنے ایش ہے اور اگر خدا نہ خواستہ غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرد ہو، ہم اس بوجھ کو مردانہ اٹھا رہے ہیں، تم بھی اٹھاؤ، اگر مرد ہو۔“ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب نے اس رنج کو مردانہ وار اٹھایا، ان کے یہاں غم شادی بھی ہے اور نوحہ غم بھی۔ ”ایک فلسفیانہ احساس ہے جس میں رنج و راحت دونوں کی گنجائش ہے“ اور شاید دونوں کی آرزو، اسی نے ان کے بار حیات کو ہلکا کر دیا ہے اور یہی ان کا پیغام ہے، اگر غزل گو شاعر کو کوئی پیغام ہو سکتا ہے۔

مرزا غالب کو نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی۔ یہ سعادت، یہ بزرگی، یہ عظمت عام نہیں ہے۔ سعدی، ظہوری اور ملتن کے علاوہ بہت کم لوگوں کو یہ مرتبہ حاصل ہے۔ غالب کے شاعرانہ ابداعات اپنی جگہ بالکل غیر فانی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن اگر خاکم بدین دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوط غالب ہوتے، تب بھی ان کا مرتبہ اردو انثر پچھر میں دہی ہوتا جو آج ہے۔

غالب اور بے صبر

غالب کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ ان کے شاگردوں نے ان کے ساتھ جس محبت اور عقیدت کا ثبوت دیا ہے، وہ اردو کے کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خود غالب کی شخصیت میں دل نوازی اور محبوبی کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔

ان کے شاگردوں میں منشی بال مکند بے صبر سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ سوانح عمری بے صبر میں لکھا ہے کہ وہ مرزا گوپال تفتہ کے بھانجے تھے اور "۱۸۱۰ء میں بہ مقام سکندر آباد پیدا ہوئے تھے یہ مالک رام صاحب نے ان کی ولادت کی تاریخ نہیں لکھی۔ البتہ وفات کی تاریخ بغیر حوالے کے ۱۸۹۰ء اور عمر شریف ۷۵ لکھی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ مضمون "سوانح عمری بے صبر" چونکہ بے صبر کے چھوٹے بیٹے سری برہاسروپ نے اور بے صبر کے انتقال کے فوراً بعد لکھا ہے اس لیے

لے سوانح عمری بے صبر مقالہ پیر خوند بے صبر بحوالہ اردو ادب، ج ۲، ص ۹۲۔

تہ تلامذہ غالب، ص ۵۵

تہ ایضاً

اہم ہے۔ اس میں لکھا ہے :

”(بے صبر نے) بجھتے برس کی عمر میں ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء (۱۳۰۳ھ)

شہور اتری کو بمقام میرٹھ رحلت فرمائی۔“

مالک رام صاحب کے بیان سے بے صبر کی تاریخ ولادت ۱۸۲۰ء قرار پاتی ہے لیکن مؤخر الذکر نے اپنی تاریخ ولادت خود نکالی ہے جو اس بیان کے خلاف ہے۔

مراسل ولادت ہندو سی میں جو کوئی صورت و معنی میں پاوے
تو کر دے قافیہ کو دور تا ہاتھ ہزار و ہشت صد شصت و نہ پانچ
(= ۱۸۶۹ ہندو سی)

بے صبر کا ترجمہ منشی دیو پرشاد بٹاشن نے ”مذکرہ آثار الشعراء ہندو میں دیا ہے :

”بے صبر تخلص منشی بال مکند ولد رے کانہ سنگھ کا یہ بھٹناگر سکندر آباد ضلع بلند شہر۔ اب عمر قریب ستر برس کے ہے۔ پندرہ برس کے سن سے اب تک شعر کہتے ہیں۔ فارسی اور اردو میں مرزا غالب کے شاگرد ہیں۔ صاحب دیوان اور تصنیفات متعددہ جن کی تفصیل تذکرہ معیار الشعراء ہندو میں کہ جہاں فارسی کلام ان کا درج ہوا ہے، قلم بند ہو چکی ہے، ۱۷ برس کی عمر سے ۳۷ برس تک مناصب داروغگی و منشی گیری وغیرہ سرکار انگریزی پر مامور رہ کر اب پنشن دار ہیں اور رٹ کے نوکر چاکر۔ سوائے علم عربی فارسی عربی اور کچھ سنسکرت کے جملہ فن شاعری اور علم الہی و تاریخ و جغرافیہ و نجوم و منطق و مذاہب سے خیلے واقف ہیں و مذہب خدا پرستی موحدانہ رکھتے ہیں اور ذوق، مومن، غالب، تفتہ اور شیعہ وغیرہ شعراء نامی کے ہم عصر اور ہم مشاعرہ ہیں۔ راقم تذکرہ سے بھی خط و کتابت ہے اور مندرجہ ذیل کلام خود ان کا اس تذکرہ کے لیے بھیجا ہوا ہے اور حق یہ ہے کہ ہماری قوم میں غنیمت ہیں

لے سوانح عمری تذکرہ مکتوبات بے صبر قلمی (بہ نگر، عریزی پریس، گوبند ناگ) ورق ۱۳۵ الف

اور قابلِ افتخار ہے۔

مالک رام صاحب نے تفتہ سے مشورہ سخن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ نہ بٹاش کے تذکرے میں ہے اور نہ سری برہما سرورپ کی لکھی ہوئی سوانح عمری میں۔ حالاں کہ یہ دونوں بے صبر کو قریب سے جاننے کے مدعی ہیں۔ موخر الذکر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ :

”بوجہ موزونیت طبیعت خدا داد اور بہ صحبت مرزا منشی ہرگوپال تفتہ کہ

ماموں جناب موصوف کے تھے شوق شعر و سخن دامن گیر ہوا۔“

حقیقت یہ ہے بے صبر اور تفتہ میں رشتے داری کے علاوہ خواجہ تاشی کی نسبت تھی اور اسی نسبت کا بے صبر نے اپنے کلیات میں ذکر بھی کیا ہے۔ اپنے قصیدہ نمبر ۴۷ مسمیٰ بعقد پرویں میں جو ”مرزا تفتہ صاحب مظلہ“ کی شان میں ہے، فرماتے ہیں :

میں اور وہ دونوں شاگردِ حضرت غالب

یہ خواجہ تاشی کی نسبت ہے درمیاں پیدا

قصیدہ نمبر ۳۷ مسمیٰ قندِ مکرر میں غالب اور تفتہ دونوں کی تعریف کی ہے اور اسی التزام کی وجہ سے اس کا نام ”قندِ مکرر“ رکھا ہے۔ اس میں گریز کا شعر ہے ۷

غالب خوش خیال اور تفتہ تیرنِ مقال
سختے ہیں سخن کو جو عزت و احترام دو
اس کے بعد کہتے ہیں ۸

نثر کے کار و بار کے ہیں ہی دونوں منصرم
نظم کے کارخانے کا کرتے ہیں انصرام دو
قندِ مکرر اس لیے نام قصیدہ ہے کہ میں
اس میں سنائے غالب تفتہ کے التزام دو
بے صبر کو غالب سے بڑی محبت تھی۔ ان کے کلیات میں جا بجا اس قسم کے اشعار
ہیں جن سے ان کی والہانہ عقیدت اور ارادت ظاہر ہوتی ہے۔ بار ہواں قصیدہ مسمیٰ پر کالہ آتش

لے مذکورہ آثار اشعار چند مرتبہ غفری دبی پراشاد و تاشی غلط تحریک لالہ سمیت بطور نہ طبع رضوی دہلی ستمبر ۱۸۸۵ء ص ۳۲۔ بٹاش نے بے صبر کے انتقال کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اس تذکرے کی طباعت ستمبر ۱۸۸۵ء میں شروع ہوئی ہے۔ نقشہ فہرست شولے تذکرہ مرتب کرتے وقت بھی انھوں نے اصلاح اور صحت کا خاص اہتمام نہیں کیا۔ اس میں بھی یہ ہلو ہے ”میرٹھ میں پنشن پاتے ہیں۔“ تکمیل طباعت کی تاریخ ۱۸ جونری ۱۸۸۶ء مندرج ہے۔

سے ایضاً۔ ورق ۱۸۸ ب

سے کلیات بے صبر تکلی مستذکرہ۔ ورق ۳۷ ب

”حضرت اساذی مولانا اسد اللہ خاں صاحب غالب“ کی مدح میں ہے مطلع ہے ے
چشم بد دور ہے تر دیدہ گریاں میرا چادر آب کا اک پاٹ ہے داماں میرا
مدح کے اشعار ہیں :

جس کا غالب ہے تخلص اسد اللہ ہے نام یہ تو ہے کفر جو کہیے کہ ہے یزداں میرا
پر ہے ہادی مرا زبیر مرا استاد مرا قبلہ ہے کعبہ ہے دین میرا ہے ایماں میرا
مفلک کو گیا ہے حدیث اس کا جزا در دو ہے کلام فارسی اس کا وہ دیوان ہے قرآن میرا
انور ہے وہی اور وہ ہی مرا احسان قانی آگرہ منہ ہے اور دلی ہے شرواں میرا
فاریاب اس کا ہے گھر کوچہ ہے اس کا ساجج ہے ظہیر اپنا وہی اور وہی سلماں میرا
درِ عرفی و شفائی پہ جبیں سا نہیں میں کعبہ شیراز ہے نے قبلہ صفا ہاں میرا

نام پر کالہ آتش ہے قصیدے کا مرے
کہ وہ بے صبر ہے سوزِ دل سوزاں میرا
ایک موقع پر بڑے فخر سے کہتے ہیں ے

شاعروں پہ کیوں نہ غالب آؤں اے بے صبر میں
حضرت غالب ہیں آخر کو مرے استاد بھی
اس کلیات کا ۲۲ واں قصیدہ بھی مسمی ”دو دل“ غالب کی مدح میں ہے اور
اس طرح شروع ہوتا ہے :

یکتائی جس طرح سے ہے جاناں کو جاں کے ساتھ
ہے یک دلی سخن کو ہماری زباں کے ساتھ
بحر رواں سے موج کو ہے جس طرح سے ربط
بحر سخن کو ربط ہے طبع رواں کے ساتھ
مانند لفظ و معنی و مانند جسم و جہاں
مثل صفات و ذات نہاں ہے عیاں کے ساتھ

جب تک پھرے گا چرخ، پھرے گے نہ میرے دن
گردش مرے نصیب کو ہے آسماں کے ساتھ

اس کے بعد لکھتے ہیں یہ

سودا و تیر و مصحفی و جرأت اور درد
مجکو نہیں ہے کام کچھ ان رفتگاں کے ساتھ
ممنون و مومن، آتش و ناسخ، نصیر و ذوق
کچھ واسطہ نہیں ہے ان اہل زباں کے ساتھ
جو ہر سے ہے ذرے کو نسبت، وہی مجھے

نسبت ہے میرزا اسد اللہ حنا کے ساتھ
غالب ہے غالب الشعرا کا مرے لقب
رشتہ تلامذہ کا ہے اس نکتہ داں کے ساتھ
اس شاہِ ملکِ نظم سے ہے مجکو مشورہ

مثل بزرگمہر ہوں نوشیرواں کے ساتھ
نام آوری وہ کیا ہے جو ہو مدحِ شاہ سے
شہرتِ ظہیر کو تھی قزل ارسلان کے ساتھ
معنی نے اس کے شعر اڑائے جہان میں

عنقا یہ وہ ہے اُرتا ہے جو آشاں کے ساتھ
دعویِٰ برابر ہی کا ہے اس کو کمال سے
دلی کو ہم سری کا ہے سراصفہاں کے ساتھ
لطف ان کا کون اٹھا ہے بغیر از لطیف طبع

لاکھوں لطیفے اس کے ہیں لطفِ زباں کے ساتھ
باوصف کثرت اس کا سخن بھی گراں بہا
ارزاں یہ جنس بکیتی ہے نرخی گراں کے ساتھ

ہنگام ذکرِ خندہ دندانِ منامے دوست
 ہے گل فشانی بھی سخنِ درخشاں کے ساتھ
 سخت اس کا ہے جوان، و خرد اس کی پیر ہے
 پیروں کے ساتھ پیر و جواں ہے جواں کے ساتھ
 جام و صراحی و نئے و جنگ اس کے (پاس) ہیں
 مسرور ہے سدا انھیں خورد و کلاں کے ساتھ
 ایراں کو عہدِ غالبِ عالی جناب میں
 تابِ مقاومت نہیں، ہندوستان کے ساتھ
 "دوِ دل" اس قصیدہ کا بے صبر نام ہے
 سوزِ دروں ہوں مجھ کو ہے نسبتِ دغاں کے ساتھ
 قصیدہٴ اعجازِ سخن میں غالب کی پیروی پر فخر کیا ہے
 خوب کی پیروی حضرتِ غالب شاہِ باش
 کہ وہ ملت میں مصدی کے لیے بچھلا مرصل (کڑا)
 نام بے صبرِ قصیدے کا ہے "اعجازِ سخن"
 اس کا ہر فقرہ مضمون ہے مالاہِ نخیل
 اور بعض قصیدے غالب کی زمینوں میں لکھے ہیں۔ کلیاتِ نظم غالب میں غالب کا
 مشہور قصیدہ ہے
 خیر: تابنگری بہ شاخِ نہال طوطیانِ زمر دیں تمثال
 بے صبر نے اسی زمین میں ایک قصیدہ عید کی تہنیت میں "دل فریب" کے
 عنوان سے لکھا ہے۔ مطلع ہے :

۱۔ کلیاتِ بے صبر قلمی ورق ۱۴۳ ب ۲۔ ایضاً ورق ۱۶۸ ب
 ۳۔ کلیاتِ نظم غالب : ذیل کشور ۱۹۲۵ء ص ۲۶۹۔ کلیاتِ بے صبر تذکرہ میں غالب کا یہ شعر
 اس طرح درج ہے :
 خیر: تابنگری بہ شاخِ نہال طوطیانِ زمر دیں پروبال

نسبت ابرو سے یار سے بے کمال عید کا چاند کیوں نہ ہو مے ہلال
 اسی طرح بعض غزلیں بھی غالب کی زمینوں میں کہی ہیں۔ غالب کی مشہور غزل ہے
 نمایاں مجھ سے، بیاباں مجھ سے۔ اس میں بے صبر نے غالب کے مصرع پر گڑھ لگائی ہے :
 شب تنہائی میں بے صبر بہ قول غالب سایہ خورشید قیامت میں ہے یہاں مجھ سے
 غالب کی غزل ہے "دیدار ہے، سرشار ہے" اس کا ایک شعر بے صبر نے
 اپنی غزل کے حاشیے پر لکھا ہے :

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
 ہر کوئی در ماندگی میں نالے سے ناحیا ہے
 اس زمین میں بے صبر نے کیا اچھا شعر کہا ہے ۛ

ہر طرف سے اب ترے عاشق کے اوپر وار ہے
 تیرے ترے تیرے اور تلوار پر تلوار ہے ۛ
 کلیات بے صبر میں کتابت کی بہت سی غلطیاں ہیں۔ اس میں غالب کا ایک
 مطلع اس طرح درج ہے ۛ

گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے تسکین کو دی نوید کہ مرنے کی آس ہے
 دیوان غالب کے نسخہ 'عرشی' میں یہ شعر یوں مندرج ہے :
 گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے تسکین کو نوید کہ مرنے کی آس ہے ۛ
 اس زمین میں بے صبر کی غزل کا مطلع ہے ۛ

پاس آئیے ذرا نہ مقام ہر اس ہے خدمت میں آپ کی مجھے کچھ التماس ہے
 بے صبر نے "بے قراری ہے، کاری ہے" اس زمین میں بھی غالب کی
 پیروی میں غزل کہی ہے ۛ

ۛ ایضاً ورق ۱۰۲ الف

ۛ کلیات بے صبر قلمی ورق ۱۵۵ ب

ۛ ایضاً ورق ۹۰ ب۔ نیز دیوان غالب نسخہ 'عرشی' ص ۲۱۲۔ ۛ کلیات بے صبر قلمی ورق ۹۰ ب

ۛ کلیات بے صبر قلمی ورق ۹۲ الف

ۛ نسخہ 'عرشی' ص ۲۰۳

بے قراری سی بے قراری ہے کہ زمین زلزلہ میں ساری ہے
 وجہ آنکھوں سے میری جاری ہے کوئی طوفاں ہے یا کہ رازی ہے
 بے صبر نے غالب کی اس غزل میں بھی شعر کہے ہیں ۛ
 رفتارِ عسر قطع رو اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
 بے صبر کا مطلع ملاحظہ ہو ۛ
 جو تجھ بغیر، شیشہ و جام شراب ہے اپنا دل پر آتش و چشم پر آب ہے ۛ
 غالب کا مقطع ہے ۛ

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
 نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں
 بے صبر نے اس ردیف قافیہ میں بھی غزل کہی ہے۔ یہاں صرف مطلع درج
 کیا جاتا ہے ۛ

دمِ ناصح ہے بند اک شور و حشت ہے زمانے میں
 مئے ہے کون طوطی کی صداقت ارخانے میں ۛ
 غالب کی شہرہ آفاق غزل ہے ”دنیا مرے آگے، تماشا مرے آگے“ اس
 کا ایک شعر بے صبر نے حاشیے پر اس طرح درج کیا ہے :
 گویا تھ میں طاقت نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
 رہنے دو ابھی سا غر و مینا مرے آگے
 مولانا عرشی نے پہلا مصرع اس طرح تحریر فرمایا ہے :
 ”گویا تھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے“
 بے صبر کا مطلع ہے ۛ

ۛ کلیات بے صبر تذکرہ، ورق ۸۹ ب

ۛ ایضاً ورق ۸۸ ب

ۛ ایضاً ورق ۹۰ ب

جب منہ سے نقاب اس نے اٹھایا مرے آگے
ایک نور کا عالم نظر آیا مرے آگے
بے صبر نے جرات کی تقلید میں بھی شعر کہے ہیں
کچھ بن آتی نہیں بے صبر بہ قول جرات
قید عصمت میں ہے وہ جس کے گرفتار ہیں ہم
جرات کی غزل پر ایک سدس کہا ہے

مدت سے شب وصل کے ہونے کی خبر تھی
ہر شام سے تا صبح نظر جانبِ در تھی
سو آج وہ شب رشکِ شبِ قدر مگر تھی
لیکن نہیں معلوم گھڑی تھی کہ پہر تھی
کچھ ہم تو نہ سمجھے کہ شب وصل کدھر تھی
نمک زلف سے منہ پر جو نظر کی توسعہ تھی
بے صبر نے غالب کے انتقال کی تاریخیں بھی کہی ہیں

ہماں میرزا غالب استاد من
بجاں آفریں جاں چو آئینہ سپرد
پر پریدم از دل سن رَحلتش
بنالید و گفت آہ غالب بمرود

۱۲۸۵ھ

اردو کا قطعہ ہے

اسد اللہ خاں وہ غالب آہ
جب سدھالے بسوے خلہ، ہوئے
جس سے اہلِ کلام تھے مغلوب
سخن ان کے الم میں سینہ کوب

۱۔ کلیات بے صبر مذکورہ ورق ۴۳ الف ۲۔ کلیات بے صبر مخطوط ورق ۱۲۰ ب

۳۔ ایضاً - ورق ۱۳۶ الف

اس پہر سخن کے اختہ کا مجکو سالِ غروب تھا مطلوب
کہا عیسیٰ نے از سرِ حسرت ہوا جیف آفتابِ ہند غروب

۶۱۸۶۹

بے صبر کو یہ ”دیوان“ بہت عزیز تھا:

شعر سن کر جس کو دیوانہ کہا کرتے تھے آپ

اب وہی بے صبر دیکھو صاحبِ دیواں ہوا

اس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا غالب نے اس دیوان کی (جس کو کلیات کہنا زیادہ صحیح ہے) اصلاح دی تھی۔

جب حضرت غالب نے دی اصلاح اس دیوان کو

بے صبر کامل ہو گیا اور معتبر میرا سخن

بے صبر نے اس اصلاح کی تاریخ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) درج کی ہے۔

مخطوطہ کلیات بے صبر کا یہ تعارف نامقام رہے گا اگر اس کے پہلے قصیدے ”نوبہار“ کا ذکر نہ کیا جائے جو ہندوستان کی تعریف میں ہے اور جس کو میر خیال میں اردو کی وطنی شاعری میں اولیت کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس میں وطن کا جو تصویر پیش کیا گیا ہے وہ شعراے ماقبل سے مختلف اور نیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ ”دیوان“ ۱۸۵۷ء میں اصلاح پا کر مرتب ہو گیا تھا۔

ورق ۱۳۷ الف :

خطہ دل نشیں ہے ہندوستان خاک روئے زمیں ہے ہندوستان
دل نشیں کیوں سوا ہے اس کا گر سوید انہیں ہے ہندوستان
دو طرف بحر و یک طرف ہے سندھ یک طرف تاج ہیں ہے ہندوستان
مرد و زن یہاں کے خور و غلماں ہیں رشک حنلہ بریں ہے ہندوستان
یہاں کے عارف جہاں میں ہیں معروف مجمع العارفین ہے ہندوستان

.... ورق ۱۳۸ الف :

پہلوان و حکیم و عارف سے کبھی خالی نہیں ہے ہندوستان

کہ بہت اولیں ہے ہندوستان
 دو جہاں آفریں ہے ہندوستان
 پُرگل و یاسمیں ہے ہندوستان
 کہ عجب گل زمیں ہے ہندوستان
 خط روے حیس ہے ہندوستان

شاہِ نازیں ہے ہندوستان
 دامن و آستیں ہے ہندوستان
 کہ ازل سے گزیر ہے ہندوستان

کہ سبک آ بگیں ہے ہندوستان
 کیونکہ اس کی زمیں ہے ہندوستان

ہے تواریخ ہند سے ظاہر
 یہیں برہما تھا جہد ہر دو جہاں
 جہاں دیکھو وہاں ہے باغ و بہار
 کہتے ہیں گل زمین کے سیاح
 مردم چشمِ حُسن ہیں ہندی
 ورق ۱۳۸ ب :

ناز اس کا نہ کیوں نیاز آٹھائے
 پائے تمکین کو دستِ بخشش کو
 حق ابد تک رکھے اسے آباد
 ورق ۱۳۹ الف :

حق اسے سنگِ تفرقہ سے بچائے
 نو بہار اس قصیدہ کا ہے نام

غالب اور آزرده

مفتی صدر الدین خاں آزرده دہلوی کا پایہ علم و فضل اور نجابت و شرافت میں بہت بلند ہے۔ وہ مولانا فضل امام خیر آبادی اور حضرت شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے اور دہلوی فضل حق کے ہم سبق۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک فارسی خط میں جو انھوں نے لکھتے کے مولانا امین اللہ کے نام لکھا تھا، ان کا شمار دہلی کے "فضلائے نامدار" میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ "فنون عقلی و نقلی اور ادب و اصول میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔"

تذکرہ کریم الدین میں لکھا ہے :

"آزرده گنجینہ علم و کان حلم و بحر سخا، مخزن لطف و جود و عطا، لبیدِ دوراں، حسان ہندوستان، عالم کامل، فاضل اجل، نقیہ رہے مثل، عالم باعلیٰ مدح میں ان کی جو کھوں سو کم ہے، کیوں کہ وہ ایسا ہی عالم ہے ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرہ شعرائے اردو میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا ان کا نام لکھوں مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ بدوں نام نامی ان کے کی یہ کتاب رونق نہ پاوے گی اور پسندِ احباب

نہ ہوگی کیوں کہ اس زمانہ کے شعراُردو گویوں میں مثل شاہنشاہ کے ہیں“
مولوی بشیر الدین احمد دہلوی نے لکھا ہے :

” (آزردہ) ایسے مجمع اوصاف حمیدہ اور خصائل برگزیدہ کے تھے کہ آج
کا نام نیک اور شہرہٴ معدلت ضرب المثل ہے..... بے شائبہ، تکلف و
بے آمیزش ایسا فاضل اور ایسا کامل سوائے سرگردہ علماء کے بساط
عالم پر جلوہ گر نہ تھا۔“

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ آزردہ کے دیوان خانے میں اہل علم کا مجمع رہتا
تھا اور اس کی حیثیت ایک اکیڈمی کی سی تھی۔ ان کا مذاق سخن بہت پاک تھا۔ افسوس
ہے کہ ان کا نہ تو دیوان ملتا ہے اور نہ تذکرہ شعرائے ریختہ۔ لیکن حالی نے جو اقوال اُن سے
منسوب کیے ہیں ان سے ان کی نکتہ سنجی اور سخن بھی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

یہ اشعار ایک اعلیٰ درجے کا شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

کامل اس فرقہٴ زہاد میں اُٹھانے کوئی کچھ ہوئے تو یہی زندانِ قدحِ خوار ہوئے

مکھڑا وہ غضب زلفِ سیاہ فام یہ کافر کیا خاک جیے کوئی، شب ایسی، سحر ایسی

اے دل تمام نفع ہے سودےٴ عشق میں اک جان کا زیاں ہے سوا یا زیاں نہیں
ملنا ترایہ غیر سے ہو بہرِ مصلحت ہم کو تو سادگی سے تری یہ گمان نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ اک تہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی، جاں نہیں
کتنی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق شاید کہ گردشِ آج تجھے آسمان نہیں

لے تذکرہ کریم الدین، ص ۱۴۶ اس کے علاوہ ملاحظہ ہو سخن شعرا (نوکلشور) از نساج، ص ۲۲۔

لے واقعات دار الحکومت دہلی، ج ۲، ص ۱۴۸ (شمسی شین پریس، آگرہ)۔

افسردہ دل نہ ہو در رحمت نہیں ہے بند کس دن گھلا ہوا دیر پیسہ مغاں نہیں
آزردہ نے پڑھی غزل اک مے کہے میں گل وہ صاف تر کہ سینہ پیر مغاں نہیں

دامن اس کا تو بھلا دور ہے ہاں دست جنوں کیوں ہے بیکار گریباں تو مرادور نہیں

گھر سے گھبرا کے کھلے بالوں ہر اک کھٹکے پر کیوں نکل آتے ہو دھوکے میں جو بیتاب نہیں

اسی کی سی کہنے لگی اہل حشر کہیں پرشش داد خواہاں نہیں

غالب نے اس قطعہ میں ان کی سخن وری کا اعتراف کیا ہے۔
بند را خوش نفسا نہ سخن ور کہ بود بادور خلوت شاں مشک فتاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ حشری، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب نے شیفتہ کو ایک مشاعرے کی شرکت کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں
رنج راہ کی تلافی، مخدوم معظم و صدر اعظم مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر کے دیدار سے
ہو گئی۔ شیفتہ ہی کو ایک اور مشاعرے کا حال لکھتے ہیں کہ حضرت آزردہ اگرچہ دیر میں
آئے لیکن انہوں نے آکر دل کو صفا اور زبان کو نوا بخشی اور میں نے گریستن کی زمین
میں اپنا فارسی قصیدہ پڑھا۔ حالی کا بیان ہے کہ یہ قصیدہ بہت کامیاب رہا۔
شیفتہ نے گلشن بے خار کے مسودے میں آزردہ کا ترجمہ شامل نہیں کیا تھا اس
کو دیکھ کر غالب نے شیفتہ کو لکھا ہے:

”گہر نہ مفتن خامہ در ردیف الف بنگارش اشعار پر ویں شواز
حضرت آزردہ ازجہ است، ہرچہ ذکر خدام برجیس مقام در جریدہ ایں
فن نہ سزاوارشان فضیلت باشد، لیکن اگر بہ مقتضای فہم و محبت

جراتے بکاری رفت گناہے نبود، و در تلافی آں بہ پوزش نیاز نمی افتاد^۱
 اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیفتہ نے آزرده کا حال بڑھا کر یہ کی پوری کر دی۔ اس
 کے چند جملے ملاحظہ ہوں :

”دعویٰ اور اک علمش از جہل خیاط ازل بایں خوبی قبائے قابلیت
 بر بالائے ندوختہ و روشن گرفتار بایں روشن دلی و آگاہی آئینہ ضمیرے
 نیفر وختہ، بایں فضیلت شاعری از ایران سرکشیدہ و بایں غمت ساحری
 از بابل نرسیدہ، با خیال شرح کمال آتش طوطی خامہ من بایں قدرت گفتار
 نغمہ سنج بے زبانی است۔“

غالب نے آزرده کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جو کلیات فارسی میں موجود

ہے۔ چند اشعار یہ ہیں :

ز ان نمی ترسم کہ گرد و قعر دوزخ جہائے من دوائے گر باشد ہمیں امروز من فدائے من
 صدر دین و دولت و صدر الصدور و زنگار میر و مخدوم و مطاع و دالی و موائے من
 گویم داز نکته چیناں در دلم نبود ہر اس کینقاد و قیصر و کینخرو دورائے من
 موکبش چون مزج عام ست با غیرم چہ بحث پرشے دارد اسطو مید و دہمپائے من
 عاجزم چون در ثنائے دست بار شکم چہ کار میروم از خویش تا گیر د عطا د جائے من

خاک کویش خود پسند افتاد و جذب سجود

سجدہ از بہر حرم نگر، اشت در سبائے من

غدر کے الزام میں مولوی فضل حق انڈمان بھیجے گئے۔ شیفتہ کو سات برس کی قید
 ہوئی۔ آزرده کو بھی قید و بند کے مصائب جھیلنا پڑے، غالب نے ۱۸۶۲ء کے ایک
 خط میں لکھا ہے :

لہ کلیات شعر غالب، پنج آہنگ طبع ۱۸۶۴ء خط بنام شیفتہ

۱۔ تذکرہ گلشن بے خار (شیفتہ) نول کشور، ص ۱۱

۲۔ کلیات فارسی ص ۳۲۰ تا ص ۳۲۲

"حضرت مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روکریاں ہوئیں، آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا، نوکری موقوف، جائیداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے، فنانشل کمشنر اور لفٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائیداد واکداشت کی۔ اب نصف جائیداد پر قابض ہیں، اپنی حویلی میں رہتے ہیں، اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے، اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی، تیس چالیس روپے مہینے کی آمدنی، لیکن امام بخش کی اولاد ان کی عزت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں، فراغ بالی سے نہیں گزرتی، ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے، عشرہ ثانیہ کے اواخر میں ہیں، خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں۔"

محروح کو لکھتے ہیں :

"دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا.... اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین، ملی ماروں میں سگ دنیا موسیم بہ اسد، تینوں مردود مطر و محروم و مغموم" خطوط غالب، ص ۲۵۸۔

آزادہ کا انتقال ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ ہجری (یعنی ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء) کو ہوا۔

شمس الشعرا مولوی ظہور علی نے تاریخ وفات لکھی ہے ۷

چو مولانا صدر الدین دہلوی	امام اعظم آخر زماں بود
زہے صدر الصدور نیک محضر	بعد از دواد چوں نو شیر داں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت	کہ اس عالم نہ جائے جاد داں بود
ربیع الاول و بست و چهارم	وداع رو سوئے دار الجناں بود

چراغش بہت تاریخ ولادت

کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود

(۲۱)

آزردہ نے انتقال سے ایک دن پہلے نواب کلب علی خاں والی رام پور کو ایک خط لکھا ہے جو نہایت اہم اور غیر مطبوعہ ہے۔ اس لیے ہم اسے تمام و کمال نقل کرتے ہیں:

جناب مستطاب نواب صاحب معلی القاب جم المناصب کثیر المناقب
معدن تققد و نوازش بے پایاں، استظہار نیا از منداں، ملاذ عقیدت کیشاں
دامت عنایتکم۔

شکر الطاف والا میری طاقت سے افزوں ہے۔ حق یہ ہے کہ آپ نے میری آخری عمر میں مجھ سے ایسا سلوک کیا کہ اس کا عوض سوائے خداوند کریم کے بشر سے ہونا جملہ محالات سے ہے۔ اللہ کریم آپ کو اپنی بارگاہ والا جاہ سے دین اور دنیا میں مدارج علیا عطا فرمائے۔ میں ایک عرصہ دراز سے مرض فالج میں مبتلا تھا۔ چنانچہ جناب پر بھی تمام کیفیت روشن ہے۔ اب چند روز سے تپ اس شدت سے ہوئی ہے کہ مجھ کو زندگی سے یاس ہے۔ ایک میری زوجہ ضعیفہ اور دوسرا خواہر زادہ محمد احسان الرحمن خاں نام جس کو میں نے فرزندانہ پرورش کیا ہے اور نہایت لائق اور سعادت مند اور نیک چلن ہے، ان دونوں کو آپ کی پیروی کے جاتا ہوں، اگر ناگوار خاطر عاظر نہ ہو تو میرے بعد ان کی خبر گیری کسی قدر فرماتے رہیں۔ یہ ایک نوع کا حسن سلوک میرے بعد بھی مجھ سے ہو گا۔

پیر دم بتو مایہ خویش را

تو دانی حساب کم و بیش را

شاید یہ میرا آخری خط ہے۔ ذوالجلال والا کرام آپ کو عمر خضری اور دانش فلاطونی اور اقبال سکندری عطا فرمائے۔

لے لاڈ بیگم نام تھا۔ رام پور میں نواب صاحب کے نام لاڈ بیگم کی عرضی بھی فارسی میں ہے، جس میں انھوں نے آزردہ کے کتب خانے کی فہرست بھیجی ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کو خدو کے بعد فراہم کیا ہے۔

معروضہ پانزدہم جولائی ۱۸۶۵ء مطابق بست دسوم ربیع الاول ۱۲۸۵ھ

نیا نامہ محمد صدر الدین خاں صدر الصدور سابق دہلی

پرستہ پر لکھا ہے:

محمد صدر الدین خاں

مہر

بسیاد ضرورت زد و توبہ برد

طرفہ لطیفہ ہے کہ غالب نے آزرہ کے انتقال کے بعد جن سے زندگی بھران کے بڑے اچھے مراسم رہے اور جن کو انھوں نے میر و مخدوم و مطاع اور والی و مولاسب ہی کچھ کہا تھا، نواب کلب علی خاں کو ایک خط لکھا ہے جس میں مرحوم دوست کی بیوہ کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہے اور ان کی ضرورت کو غیر اہم ثابت کر کے اپنا کام نکالنا چاہا ہے۔ غالب کی سیرت کا یہ پہلو قابل اعتراض ہی نہیں عبرت انگیز بھی ہے، ہم وہ غیر مطبوعہ خط بحسنہ نقل کرتے ہیں:

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی جی کی تجویز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہے گا جیسا کہ میرزا جلال ایسر کہتا ہے:

ع جرعہ لطف تو بعد از ما بما خواہد رسید

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ہے۔ خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے۔ اس خط میں میں نے زوجہ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاد لہ ہے اور ساٹھ روپے کرایہ کے مکان اس کے تحت میں ہیں۔ امین الرحمن اس کا بھانجا ہے، مفتی جی کا کوئی نہیں۔

اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ آخر عمر میں تین التماسیں ہے (کذا)

لہ دارالانشاسکار دولتمدار رام پور، مثل نمبر ۲۵۶، صیغہ دوست آشنایان اس کے بعد دوسرے لاد لہ کے مقرر کر دیئے گئے۔
لہ آئندہ نے احسان الرحمن لکھا ہے۔

آپ سے، ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو روپے کا قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے، دوسرا التماس یہ کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپے مہینا جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حین حیات قرار پائے، یہ دو خواہشیں خواہ میری زندگی میں، خواہ میرے بعد اجرا پائیں۔

تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عزت و جاہ روزانہ روزوں روز شنبہ ۵ ربیع الثانی ۲۷ جولائی سال حال، عرضداشت دولت خواہ امیر اللہ

(غافہ پر ۲۷ جولائی ۱۸۶۸ء درج ہے)

یہ خط مکاتیب غالب میں نہیں ہے، لیکن اس تاریخ کے بعد کا پہلا خط مندرجہ ذیل ہے۔ دونوں میں تعلق ہے، اس لیے اس کے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں :

تین التماسیں سابق (میں) پیش ہوئی تھیں، سواب پہلے برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے، اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے ان خواہشوں کے منظور و قبول ہونے کی نوید پائی۔ انشاء اللہ اکرمیم حسب ارشاد حضور اسی برس ۶۸ میں آمد زمستان یعنی نومبر و دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائے گی اور اس کے واسطے اس کی زندگی تک تنخواہ جدا گانہ مقرر ہو جائے گی۔

باکریاں کا رہا دشواریست ہے معروضہ ۱۳ ماہ اگست ۱۸۶۸ء

غالب نے نوابان رام پور کو خاصے خوشامدانہ خط لکھے ہیں لیکن بندگی میں بھلا نہ ہونا عبدا و معبود دونوں ہی کے لیے شرمناک ہے اس لیے غالب کا جرم بڑا ضرور ہے لیکن اتنا بڑا نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے، انھوں نے انگریز حکام کی تعریف میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان کی خود نوشت کے یہ الفاظ ان کے نہاں خانہ دل کے بہت سے اسرار

لے دار الانشا سرکار دولت مدار رام پور، مثل نمبر ۲۳ صیفہ دوست آشنایاں

۷۵ مکاتیب غالب (مرتبہ عرضی) ص ۸۱، ۸۲

ہمارے اوپر ظاہر کر دیتے ہیں :

”گورنمنٹ میں اس کی (غالب کی) بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدہ مدح نذر دیتا ہے۔ اب کی بار جولاڑ صاحب کا دربار ہوا تو موافق کے دربارداروں کی فہرست کے صاحب کشتہ بہادر حصار نے کہ دریں ولایت قائم مقام صاحب کشتہ دہلی بھی ہیں، مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا، بے چارہ بسبب یہی دستی اور بے مقدمہ دہی کے لاہور نہ جاسکا۔ مجھ سے کہتا تھا کہ ستر برس کا آدمی، کانوں سے بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا اور بے شک لاڑ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا۔ خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے۔ اس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدہ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بسبیل ڈاک لاڑ ڈالسن براگوزر سابق کی معرفت بھیجا ہے اور اوائل ۱۸۵۶ء میں نین خط انگریزی بے واسطہ انڈیا گورنمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں۔

ان امور میں زیادہ سے زیادہ اس زمانے کے مخصوص حالات اور غالب کی نجی وقتوں کی آڑ لی جاسکتی ہے لیکن ان کا جو معاملہ بعض معاصرین اور خاص طور پر آزرہ کے ساتھ رہا ہے وہ صریحاً اتنا قابل اعتراض ہے کہ اس کے لیے کوئی دھجہ جواز ڈھونڈنا مشکل ہے۔ غالب کی غفلت صرف ان کی تخلیقات میں نظر آتی ہے جہاں وہ اپنے طبقے اور سماج کی خرابیوں سے بلند ہو کر اپنی سحر کار آواز سے سب کو متوجہ کر لیتے ہیں۔

غالب کی شخصیت اور شاعری

میں

ترکی، ایرانی عناصر

انیس سو اہتر کے متعلق: ۱۹۶۹

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہندوستان ہی کی تاریخ میں نہیں، بلکہ نوع انسانی کی تاریخ میں۔ اس سال آدم خاکی
کو وہ عروج حاصل ہوا کہ افلاک اس کی ہمت کے آگے سرنگوں ہو گئے، ستارے کانپ
اٹھے، چاند سہم گیا۔ انسان کے سیفر، جہانِ قمر میں پہنچ گئے اور انسان نے اس
کرہ ارض کو، جس پر ہم رہتے ہیں، پہلی دفعہ زمین سے ہٹ کر بطور اکائی کے دیکھا اور
یہ محسوس کیا کہ ہماری فلاح اور ترقی کا راز صرف یہ ہے کہ ہم اپنے کو بڑی
وحدت کا جز سمجھیں۔ اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں،
نظام شمسی کے کروڑوں چھوٹے چھوٹے تیاروں میں سے ایک ہے اور فضا نے بیط
میں اس کی حیثیت ایک ذرے سے زیادہ نہیں۔ یہ علم جو اس کو حاصل ہوا، وہ اس کا

عشر عشر بھی نہیں جو ابھی اس کو حاصل کرنا ہے۔ اس طرح انسان کو پہلی دفعہ اس کا یقین ہو کہ نوع انسانی کے ارتقا میں انسانی ذہن بھی برابر کا شریک ہے۔ وہ غلام طبعی سے علیحدہ نہیں بلکہ اس کا باشعور اور غیر مغلوب حصہ ہے اور انسان اپنی بے پناہ ذہنی اخلاقی اور جمالیاتی صلاحیتوں کو ابھار کر اور نئے معانی کی تخلیق کر کے بلند تر اور برتر سعی و عمل کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے نقطوں میں یوں سمجھیے کہ انسان کی ترقی میں سب سے اہم حصہ خود اس کے ذہن اور فکر کا ہے۔ لیکن طوفِ قمر، داغِ جگر بھی تو ہے اور اس کا درماں اگر ہے تو صرف دانشوروں، عارفوں، فنکاروں اور شاعروں کے پاس ہے۔ اس لیے کہ مکمل انسانی ہزار ترقی کرے، وہ اقدار کی محرم اور زندگی کے سوز و ساز کی شریک نہیں ہو سکتی۔ وجدان اور فکر کے یہ معجزے ہماری تہذیب کی ابدی دولت ہیں اور ان کے تسلسل ہی پر ہماری ترقی کا انحصار ہے۔ ان کی تخلیق میں دانشور کی فکر، شاعر کا ذہن، رسا، عارف کا وجدان، صحیح اور صوفی کا قلب گداز سب ہی شامل ہیں۔ اور ان ہی کے ذریعے زندگی کا قافلہ آگے بڑھتا ہے اور ماضی، حال اور مستقبل میں نئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی ترقی کی بنیاد یہی تہذیبی تسلسل ہے جو ترکیب و امتزاج کے ذریعے اور محسوسی تہذیب کی شکل میں ہم کو عہد بہ عہد، اور نسل بعد نسل ملتا رہتا ہے اور جس کے ذریعے ہم ہر نئی نسل کو حسن معنی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس اعتبار سے میں مرزا غالب کی یاد منانے کو ہوں۔ اس لیے کہ ذہن کی تربیت تہذیبی ورثے سے ہوتی ہے اور دل و دماغ کی سیرانی میں ان ادبی کارناموں کی بڑی اہمیت ہے۔ ہندوستان تہذیبی دولت سے مالا مال ہے لیکن اس تو نگری میں غالب کی تخلیقات نے مزید اضافہ کیا ہے۔ ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ، حیرت انگیز کارناموں سے مملو ہے۔ اس نے دنیا کی تہذیب کے نقش میں اپنی شوخی، تحریر سے رنگ بھرا ہے اور اس کے مرتع کو پہلے سے زیادہ اونچی محراب پر سجایا ہے۔ مثال کے طور پر عہدِ قدیم کی مقدس کتابیں، جہاں تا بدھ کی

تعلیمات، اشوک اور اکبر کے کا زمانے، کالی داس کی شکنتلا، سانچی کے آثار، اجنتا کے نقوش، جنوبی ہند کی بُت تراشی، اڈیسہ کے مندر، آگرہ کا تاج محل، فتحپور سیکری کے محلات، دہلی کی مساجد اور قطب مینار، حضرت نظام الدین اولیا، کبیر اور نانک کا تصوف، اُردو کا آغاز اور تقا، میر جانی کے گیت، میر کی غزلیں، مندروں کے رقص، مغلوں کے حکمت امیر قیص، منصور اور منوہر کی رنگ کاری، بھجو اور تان سین کی نغمہ سرائی، خسرو اور غالب کی شاعری نے فنون لطیفہ کو ان جمالیاتی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے جس پر خود تاریخ کو رشک ہے۔ اس فنِ تعمیر، اس رنگ تراشی، اس مصوری، اس رقص، اس شیوہ بیانی کے پیچھے آخودہ کون سی مضطرب آرزو ہے جس نے ان فنی تخلیقات کو دوام بخشا ہے، وہ کون سا روشن ذہن کا فرما ہے جو برابری موت کی حقیقت سے انکار کرتا رہا اور یہی کہتا رہا:

مرگ، اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ہندوستان ایک عظیم الشان تہذیب کا وارث ہے اور اس باغ کی شادابی اور خوش نمائی اس میں پوشیدہ ہے کہ اس میں صرف ایک رنگ یا ایک قسم کے پھول نہیں ہیں بلکہ بہت سے رنگوں کے اور بہت سی قسموں کے پھول ہیں، اور ان سب کی شادابی پر ہمارے باغ کی شادابی اور خوش نمائی کا انحصار ہے۔ تہذیب کا وہ سرچشمہ جو مومبھدارو سے بھی پہلے پھوٹا تھا، عہدِ قدیم، عہدِ وسطیٰ اور عہدِ جدید کے میدانوں سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اور ان مختلف تہذیبی نہروں نے ہمارے باغ کو اتنا سرسبز و شاداب بنا دیا ہے کہ باوجود ہزاروں ماہ و سال گزرنے کے اس پر کسی قسم کی گمراہی کا اثر نہیں۔ یہاں مختلف قومیں اور تہذیبیں آئیں۔ ان میں آویزش بھی ہوئی اور آمیزش بھی۔ لیکن ان موجوں نے اس تہذیب کی مٹی کو پہلے سے زیادہ زرخیز بنادیا اور اس تمدن میں وہ رنگارنگی، وہ خوب صورتی، وہ گہرائی، وہ گیرائی پیدا کر دی جو ہمارا ہی نہیں، نوعِ انسانی کا بیش قیمت دامن ہے۔

ہندوستانی تہذیب میں جو بنیادی عنصر کارفرما ہے وہ کثرت میں وحدت اور مظاہر کی رنگارنگی میں اصل حقیقت اور مابہیت کی جستجو ہے۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ نقاشی کے ذریعے مجھے عرفان الہی کی ایک مخصوص انداز میں آگہی حاصل ہوتی ہے۔ غالب نے پتھروں میں قصبتانِ آرزوی کا نظارہ کیا ہے۔

غالب کی شاعری میں بھی انہی بنیادی تصورات اور اسی جمالیاتی شعور کی کارفرمائی ہے۔ غالب کی شخصیت کا تار و پود ترکی، ایرانی اور ہندی عناصر سے مل کر بنا ہے اور ان کے ذہن کے تمام نقش و نگار ان کی طبیعت اور مزاج کے علاوہ ان کی طبعی اور معاشی ماحول اور تمدنی اور تہذیبی ورثے نے مل کر ترتیب دیے ہیں۔ یہی وہ تشکیلی اثرات ہیں جنہوں نے ان کی جمالیاتی اقدار کی صورت گری کی ہے اور جو میرے اس لکچر کا موضوع ہیں۔ اس لیے کہ اگر ہم غالب کے افکار کی نفسیات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان تہذیبی عوامل کی نشاندہی کرنا ہوگی جو صدیوں اور نسلوں سے گزر کر اور چین کر ان کی شخصیت اور شاعری میں یہ نشین ہو گئے تھے جنہوں نے ان کو قدروں اور معیاروں کا ایک ہم آہنگ تصور بخشنا اور جن کی بدولت ان کی شخصیت میں دلکشی اور شاعری میں توانائی اور تازگی پیدا ہو گئی۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ انسان فطرت سے ہم آہنگی یا کشمکش کے ذریعے جو تجربات حاصل کرتا ہے تہذیب اسی کی مرتب شکل ہے۔ راز فطرت کی تلاش جستجو اور فطرت کے خلاف جدوجہد تہذیب کے سفر کا زاد راہ ہیں کسی خاص تہذیب کے انداز کا انحصار انسان کی طبیعت اور مزاج کے علاوہ اس کے ماحول کی نوعیت اور ان کے باہمی عمل اور ردِ عمل پر بھی ہوتا ہے۔ اس طرح سوچیے تو معلوم ہوگا کہ غالب کی شخصیت اور شاعری کو ہند، ایرانی، ترکی تاریخ کے پس منظر ہی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے اجتماعی ورثے، ان کے ملکی ماحول اور ان کی شخصی افتاد مزاج نے باہم مل کر یہی ان کے ذہن کے نقش و نگار ترتیب دیے ہیں۔

غالب کے اجداد وسط ایشیا کے رہنے والے تھے اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں آریائی تہذیب کی پہلی کرن پھوٹی۔ اس جغرافیائی علاقے کی ہندی قدرت نے کچھ اس طرح کی

ہے کہ ایک طرف کوستان الطائی ہے، دوسری طرف بحر کیپین۔ نیچے پامیر اور قراقرم کے پہاڑ۔ مشرق میں گوبی کا بگتیاں اور مغرب میں آمو۔ سردریا اور زرافشاں کے چھوٹے چھوٹے نخلستان۔ یہی وہ خطہ ہے جو تہذیب کا گہوارہ کہلاتا ہے۔ ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ یہ علاقہ ایک زمانے میں جھیلوں اور آبشاروں سے بھرا ہوا تھا لیکن آب و ہوا کی تبدیلی سے خشک ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ سیکڑوں بستیاں ریت میں دھنس گئیں۔ بارش کی قلت اور فقدان راحت سے مجبور ہو کر ترکستان کے رہنے والے ہجرت پر مجبور ہوئے اور یہ سلسلہ غالب کے انتقال سے ایک سال پہلے تک اسی شدت سے جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ۶۱۸۶۸ء میں ۸۰،۰۰۰ ترک، غالب کی زبان میں عالم ارواح کے گنہگار اپنی بے آب و گیاہ زمین چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ان کو شاداب علاقوں میں آکر پناہ لینا پڑی۔ اسی طرح بالکل دوسرے اسباب کی بنا پر ۶۱۹۵۰ء میں دوسرا ترک، لڈاخ کے راستے سے سری نگر میں آکر پناہ گزیں ہوئے اور آج بھی ان کے قبائل صفا کہل میں مقیم ہیں۔ ترک یاؤں توڑ کے نہیں بیٹھتے۔ غالب بھی کبھی مانع دشت نور دی نہیں رہے اور ان کی آوارگی سے آشنائی اور علفیت سے دشمنی، قدیمی اور ازلی ہے۔ کلکتے کا سفر بھی قطع سلسلہ شوق نہیں تھا، فرماتے ہیں :

اگر بہ دل نہ خسلد ہرچہ از نظر گذرد

زبے روانی عمرے کہ در سفر گذرد

مرزا غالب کے اصل دگوہر کا حال جیسا کہ انھوں نے جہنم دور کے دیباچے میں لکھا ہے، یہ ہے کہ ان کے بزرگ سمرقند میں آکر بس گئے تھے اور وہاں سے جس طرح سیلاب بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے، ہندوستان کی طرف منتقل ہوئے :

”ازدواپسیان این قافلہ تیامن کہ در قلمرو ماوراء النہر سمرقند شہر مسقط الراس

دے بود چون سیل کہ از بالا بہ پستی آید۔ از سمرقند بہ ہند آمد۔“

اس علاقے کو بہت سے مورخین نے ایک بڑے حوض سے تشبیہ دی ہے جب اس میں پانی بھر جاتا ہے تو وہ ہندوستان کی طرف بہہ نکلتا ہے۔ غالب نے اس واقعے کو

اس طرح بیان کیا ہے : چون سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد۔ درفش کاویانی
میں زیادہ وضاحت سے لکھا ہے :

”بالجملہ سلجوقیان بعد زوال دبرہم خوردن ہنگامہ سلطنت در اقلیم وسیع الفضاء
مادرا، النہر پر اگندہ شدہ ازان جملہ سلطان زادہ ترسم خان کہ ما از تخسہ اوسیم
سمرقند را بہر اقامت گزید۔ تا در عہد سلطنت شاہ عالم نیامے من از سمرقند
بہ ہند وستان آمد“

غالب نے اپنے فارسی اشعار میں بھی اس غلوے خاندان پر فخر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

غالب از خاک پاک تورانیم لاجرم در نسب فرہ مندیم
ایکیم از جماعت اتراک در تمامی زمانہ دہ چندیم
فن آباے ماکشا وری ست مرزباں زادہ سمرقندیم

یہ سمرقند کا علاقہ تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے لیکن اس نے چینِ قبا اور
طرفِ کلاہ کے بھی بہت سے مناظر دیکھے ہیں۔ سکندر اعظم ایک ہاتھ میں تلوار اور
دوسرے میں ہومر کی ایڈ (ILIAD) لیے ہوئے آیا اور اس نے اس مائے
علائقے کو زیر و زبر کر دیا۔ فلسفیوں نے انسانی بڑیوں کا سفوف ہاتھ میں لے لے کر
بہت پوچھا کہ اس میں بادشاہ اور غلام کی تفریق کس طرح کی جائے لیکن سکندر
نے انتقام کے جوش میں لاشوں کے پل بنا دیئے اور ایرانی تہذیب کے نادر دروژگار
ایوانوں میں آگ لگا دی۔ اسی طرح تاتاریوں کا سیلاب اٹھا جس نے اپنی ہلاکت آفریں
گرفت میں روس اور ہنگری تک سب کو لے لیا۔ اور ایسی وسیع و عریض حکومت
قائم کی جو چین کے ساحل سے لے کر ڈینیوب (DANUBE) اور نیچے پنجاب تک
پھیلی ہوئی تھی۔ اس سمرقند نے تیمور کی جہاں کشائی اور جہاں بانی کے گونا گوں
مناظر دیکھے جس میں سفاکی بھی شامل تھی، ادب نوازی بھی، معارف پروری بھی۔
چنگیز خاں کے پورے سوسال کے بعد سمرقند جاگ اٹھا اور اس طرح کہ وہ سائنس،
ادب، فنِ تعمیر اور مصوری کا عالمی مرکز بن گیا تھا لیکن اب وسط ایشیا میں ایرانی

تہذیب کے نمائندے عجم زدہ عرب نہیں تھے بلکہ ترک تھے اور ترکوں سے میسر ہی مراد،
تورانی نسل کے وہ تمام لوگ ہیں جو وسط ایشیا اور چینی ترکستان میں بس گئے تھے اور
ایران کو اپنا تہذیبی سرچشمہ سمجھتے تھے۔

وسط ایشیا سے بہت سی قومیں موج در موج ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ اسی
طرح مسلمان ترک ہندوستان میں آئے لیکن وہ حجاز کے عربوں اور اصفہان و شیراز
کے ایرانیوں سے یکسر مختلف تھے۔ خلافت کمزور اور بے دست و پا ہو گئی تھی اور
اس کے دیرانہ پر خود مختار ترکی ایرانی (TURKO-PERSIAN) حکومتوں کے محل تعمیر
ہو گئے تھے مسلسل فتحیابیوں نے مذہبی جذبے کو سرد کر دیا تھا اور اب یہ ترک برسرِ عام
کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ بات شرع کے مطابق ہے یا نہیں۔ جو بات حکومت
کے لیے مفید ہے ہم اس کا حکم صادر کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ
تمام صوفیہ، اہل تقلید، اہل ظاہر اور اہل اختیار سے نبرد آزما تھے۔ ان کے نزدیک
اقدار میں سب سے اہم قدر محبت تھی جس سے دل کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا ہے،
جذبات کی تہذیب ہوتی ہے، فرد کی اہمیت بڑھتی ہے، رواداری اور مساوات اور
جمہوریت کی جڑیں سیراب ہوتی ہیں۔ دارا شکوہ کی مجمع البحرین، شاہ غمگین کے
خطوط، غالب کے اشعار اور شفقہ فیض کے مطالب سب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس
وقت ویدانت اور اسلامی تصوف ہم آغوش ہو گئے تھے۔ ملتیں اہم نہیں رہی
تھیں بلکہ ان کے مٹنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم تھا۔

ہندوستان میں ۱۲۰۶ء میں جو حکومت قائم ہوئی وہ مزاج اور کیفیت کے
اعتبار سے ترکی ایرانی تھی یعنی اس کے آمیزہ میں ایران کا احساس جمال اور
حسن تناسب اور ترکستان کی وسیع المشرقی اور سخت کوشی دونوں شامل تھیں جو
ہندوستان کی آریائی فضا میں اُن مل بے جوڑ نہیں تھی بلکہ اُس نے اس کے حسن
کو نکھار دیا اور خود ایرانی تہذیب کے جسدِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیا۔ لیکن
ترکی ایرانی تہذیب کا احیاء دراصل مغلوں کے ذریعے ہوا، جب بابر نے اپنے

وطنِ فرغانہ کو چھوڑ کر ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ہندوستان میں قائم کی۔
غالب کا تعلق مغلوں سے براہِ راست تھا وہ نسباً اور اصلاً اس قوم کے فرد
تھے جس کا ایک قبیلہ دہلی کے تخت پر حکمراں تھا۔ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ ہے کہ
باپ کے متروکے میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ غالب کو ورثے میں یہ
ترک ایرانی ذہن تو ملا لیکن اپنے آباء کی تلوار نہ مل سکی۔ البتہ بزرگوں کو یہ تیر ٹوٹ کر
ان کا قلم بن گیا۔ "شدیر شکستہ" نیا گانِ قلم، شاعری کے میدان میں البتہ اس کی
حیثیت تیر شکستہ کی ہو گئی ہے۔

یہ قبیلہ جب ہندوستان آئے تو ان کی پشت پر صدیوں کی وراثت تھی۔ ان کے
ساتھ ایک اجتماعی ذہن تھا، جس کے سارے نقش و نگار اسی ترکی ایرانی ماحول میں
صورت پذیر ہوئے تھے۔ وہی علوے نسب کا احساس، وہی اسلام کے کارناموں پر
فخر۔ غالب ایک قطعہ میں لکھتے ہیں:

ساقی چو من پشنگی و افرا سیابیم
دانی کہ اصل گوہرم از دودہٗ جمست
میراثِ جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار
زیں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدمست

غالب کے یہاں جو جیغہ و سرترج و مالائے مروارید یا دربار و لمبر پر اتنا اصرار
ہے، اس کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔ ان قبیلوں میں عصیت بھی بلا کی تھی۔ غالب کا
تعلق ایک ترکوں میں قبیلہ برلاس سے تھا اور مجھے تاشقند اور سمرقند کے قیام میں
معلوم ہوا کہ اس قبیلہ میں یہ عصیت کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ لڑائی ہے تو سالہا سال
اور نسلاً بعد نسل جاری رہے گی۔ دوستی ہے تو اپنی کھال کی جوتیاں بنادیں گے۔ خود
فاؤ کریں گے لیکن مہان کے سامنے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیں گے۔ اسی طرح غالب
اپنی پنشن کا مقدمہ ایک دو برس نہیں مسلسل ۴۳ برس تک لڑتے رہے۔ انھوں نے
اس زمانے کی صریح بے انصافیوں کے خلاف جس کی شکایت بعض ایسا انداز انگریزوں

کو بھی تھی اور خود مقامی حکام کے خلاف گورنر جنرل سے اپیل کی۔ جب وہاں بھی دادی نہ ہوئی تو کمپنی کے ڈائریکٹروں اور آخر میں ملکہ وکٹوریہ سے اپیل کی۔ ان کی دستوبھی ایک معنی میں اسی سلسلے کی ہوش مندانہ کوشش ہے۔ جب حامیان قتل سے معر کے اور مجادلے ہوئے تو غالب اس طرح لڑے جیسے ترک اور تورانی لڑتے ہیں۔ ان ترک قبیلوں کو اپنی عزت اور آبرو جان سے زیادہ عزیز تھی۔ غالب پر فائق گذر رہے تھے لیکن دہلی کالج کی ملازمت کے معاملے میں انھوں نے صحیح یا غلط عزت کا سودا نہیں کیا۔ جوئے کے الزام میں قید ہونے تو جسیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجرم کی نہیں بلکہ بادشاہ کی سواری اس زندان خانہ میں داخل ہو رہی ہے۔ اسی طرح جسم زخموں کی کثرت سے سرو چراغاں بن گیا ہے اور موت ہے کہ روز دروازے پر دستک دیتی ہے لیکن جب توہین کا سوال پیدا ہوتا ہے یا ان کی حیثیتِ عرفی پر ضرب لگتی ہے تو وہ مولوی امین الدین پٹیلوی کے خلاف مرنے سے دو برس پہلے انگریزی عدالت میں ازالہ حیثیت کی نالش کرتے ہیں۔ اثنائے تحقیقات میں دلی کے بعض اہل قلم عدالت میں بلائے گئے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں ان سے دشنام و فحش مفہوم ہوتا ہے یا نہیں۔ ان حضرات نے ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان جملوں کے ایسے معافی بیان کیے جن سے ملزم کی پست ہو جائے۔ کسی نے پوچھا حضرت یہ تو آپ کے شناسا ہیں، انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی۔ فرمایا: میری بیکیسی کی وجہ، شرافتِ نسبی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے اور چونکہ شرافتِ نسبی میں کوئی میسر ہم جنس نہیں ہے، اس لیے میرا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔

بہرچہ درنگری جز بہ جنس مائل نیست

عیارِ بیکیسی من شرافتِ نسبی ست

قدیم ترکوں میں ایک قسم کی دنیا داری، عقلِ معاش، عیش پسندی اور پرکاری بھی ملتی ہے جو مختلف گروہوں سے مقابلے کی شدت سے آئی ہے اپنے مقاصد کو

حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ غالب کا جو یہ نواب شمس الدین خاں یا خود اپنے بھائی مرزا یوسف یا اپنے عزیز دوست مفتی صدر الدین آزر دہ کی بیوہ کے ساتھ تھا وہ ہمیں بڑا عجیب اور قابلِ اعتراض معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ان کے طبقے کی مجبوریوں کو بھی دخل ہے اور اس قسم کی متوازی مثالیں ہمیں آخر دورِ مغلیہ میں بھی مل جاتی ہیں، جہاں مقصد زیادہ اہم ہے اور طریقہ کار ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

ترکوں میں اصابتِ رائے کے ساتھ تنقید کی شدت اور عدم برداشت پائی جاتی ہے۔ باوجود ہزار محبت اور عقیدت کے وہ اداروں اور شخصیتوں کی ہکتہ چینی میں پس و پیش نہیں کرتے۔ جہانگیر کے دربار میں حضرت شیخ سلیم چشتی کے فیوضِ روحانی کا ذکر تھا۔ قاضی نور اللہ شونسری کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ یہ ذکر اچھا نہ معلوم ہوا، فرمایا: آنجو مردک بود۔ جہانگیر حضرت شیخ سلیم چشتی کا بڑا متفقہ تھا۔ ان ہی کی دعا سے پیدا ہوا تھا حکم دیا کہ مولانا کا سر قلم کر دیا جائے۔ نور جہاں نے رحم کی درخواست کی، اس نے کہا: جاناں دل دادہ ام نہ ایمان۔ اور نگ زیب نے اپنے استاد پر سخت ہکتہ چینی کی تھی کہ تم نے مجھے یورپ کی تاریخ نہ پڑھائی اور ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ دنیا میں بس مغل ہی مغل ہیں۔ اسی طرح غالب نے باوجود مغل ہونے اور مغلیہ تہذیب سے محبت رکھنے کے آئینِ اکبری پر اعتراض کیا ہے اور اس پر آئینِ فرنگ اور منہ ربی داد و دانش کو ترجیح دی ہے۔ یہی معاملہ غالب کا شاعری کے میدان میں ہے۔ ایک خط میں حزیں کے ایک مطلع پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”یہ قسم ہے یہ عیب ہے حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع جبریل کا بھی ہو تو سندنہ جانو“

غالب مغل تھے: ہاڑ چکلا، قد کشیدہ، زنگت خوب کھلتی ہوئی۔ ان کی رگوں میں وہی خون موج زن تھا جو مغل بادشاہوں کی رگوں میں تھا۔ ان ہی لوگوں کی طرح ان کو زندگی کی اچھی چیزوں سے محبت تھی۔ اچھا کھانا اچھا پینا، اچھا رہن سہن۔ باہر کی مادری زبان ترکی تھی اور غالب کے دادا کی زبان بھی ترکی تھی لیکن مغل ایرانی تمدن میں اس قدر سرشار تھے کہ انھوں نے اپنے کمالات کے جوہر فارسی میں دکھلائے اور اس کو

اپنی تہذیبی اور سرکاری زبان قرار دیا۔ پروفیسر آربری نے لکھا ہے کہ عربوں کے اثر سے فارسی زبان بھی صحرازدہ ہو گئی تھی اور ہندوستان کے طبعی ماحول نے تو اس کے رنگ و آہنگ کو ایران کے طرز و روش سے اس قدر مختلف کر دیا تھا کہ ہندوستان کے اسلوب کو سبک ہندی قرار دیا گیا۔ اس طرز کی بہت عیب جوئی کی گئی ہے جس پر چنداں حیرت نہیں لیکن افسوس اس کی ہنر پوشی پر ہے۔ متاخرین شعر کی بدولت اس میں جو سخن کاری کا عنصر پیدا ہوا۔ اس کا عدم اعتراف بدترین قسم کی ناشکر گزاری ہے۔ اس قسم کا تختیل کہ غزالے بہ صحراے جان می گذشت یا ہمہ آہوان صحراے خود نہادہ برنگ ، یا اردو میں ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام یا آہو آجائیں گے خود شوق سے گردن ڈالے ، ہندوستان ہی کے طبعی ماحول میں ممکن ہے ، تبریز و طوس میں ممکن نہیں۔

غالب کے اجداد کو ہندوستان میں آکر جس ماحول اور مزاج سے سابقہ پڑا ، وہ وسط ایشیا سے مختلف تھا۔ یہ لوگ جہاں آکر بسے وہ بالعموم سطح اور کسی قدر مرتفع میدانوں پر مشتمل تھا جنھیں بڑے بڑے دریا سیراب کرتے ہیں۔ یہاں گھنے جنگل تھے یا وسیع و عریض میدان۔ یہاں کے موسم مقرر تھے اور ان میں زیادہ افراط و تفریط نہیں ہوتی تھی۔ یہاں حقیقت ایسے زمان میں کام کرتی ہے جو معمور و مسلسل ہے اور بہ اعتبار پیمائش دایری ہے۔ یہاں کائنات ناقابل اختتام صورت میں ہے سخا شا پھیلی ہوئی تھی اور شدت حیات کے ساتھ دھڑک رہی ہے۔ بظاہر ان مختلف مناظر میں بہت فرق ہے لیکن غور کیجیے تو ساری موجودات اپنی کثرت اور بوقلمونی کے باوجود ایک حقیقت نظر آتی ہے۔ موضوع کی وحدت معروض کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے یا تصوف کی اصطلاح میں بندہ و بندہ نواز ، عاشق و معشوق کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ یہی خصوصیت ہندوستانی ذہن کی ہے وہ کائنات کی تعمیر میں اور نظام فکر کی تعمیر میں ، متعدد اور مختلف مظاہر کو ایک کپلے کے تحت لا کر ہمیشہ ان میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی عمل اس تہذیبی ورثے کے ساتھ ہوا جو

غالب کے اجداد اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کو ہندوستانی ذہن نے ترکیب و امتزاج کے ذریعے اپنے رنگ میں رنگ لیا چنانچہ جن تصوری عناصر نے ہندوستان کے اجتماعی ذہن پر اثر ڈالا، وہ سب کے سب ہندوستان کی سرزمین میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ان میں بہت سے باہر سے آئے تھے۔ ہندوستانی تہذیب میں دراوڑی، آریائی، ایرانی اور ترکی عناصر کی بڑی آمیزش ہے۔ البتہ وہی عناصر ہندوستانی تہذیب کا جزو بن سکے جو عام ملکی روح سے ہم آہنگ تھے مغلوں کے زمانے میں جو نخل بندی اور پیوند کاری کے تجربات سے گزر چکے تھے، یہ تہذیبی نقش اور زیادہ حسین ہو گیا۔ انھوں نے ترکوں کی سخت کوشی، فراخ دلی اور خود داری میں ایرانیوں کی لطافت اور شائستگی اور مساوات اور اخلاقی ضبط کی قلم لگا کر، ہندوستانی تہذیب کی اس طرح آبیاری کی کہ وہ ایک تناور درخت بن گئی اور اس کی جڑیں، جمالیاتی شعور اور تصوف کی انسان دوستی تک پہنچ گئیں۔ اس زمانے کی عمارتیں، تصویریں، تصوف کی تحریکیں اور شعر و موسیقی کے کارنامے سب اس امتزاج اور اتحاد پسندی کے آئینہ دار ہیں۔ مثال کے طور پر معرفت یا تصوف کے اس نئے راگ پر غور فرمائیے جو ہندوستان کے طبعی ماحول میں اسلامی اثر سے پیدا ہوا۔ اس میں عاشقانہ ذوق و شوق، سوز و ساز، تسلیم و رضا کے ساتھ مصلحانہ بلکہ مجاہدانہ جوش و خروش بھی ہے۔ ایک طرف نعمہ عشق ہے، ذات الہی کی محبت اور مرشد کی عقیدت سے معمور۔ اور دوسری طرف ترکوں کا نعرہ جنگ ہے، ظاہری رسوم و روایات، عقائد و عبادات کے خلاف، یہاں معبود حقیقی کا تصور، خالص باطنی تصور ہے جو بظاہر متضاد صفات کا جامع ہے۔ یہی صورت معشوق حقیقی کی ہے اور یہی کیفیت معشوق مجازی کی۔ پھر بھی ایک عارف کی نظر، اس کثرت میں وحدت کو ڈھونڈ لیتی ہے۔ خدا زمان و مکان سے باہر بھی ہے، تصور سے ماوراء بھی، صفات و قیعدات سے بری۔ داراشکوہ، طالب حسین شاہ حسنی، میرزا مظہر، میر، بیدل، غلغین اور غالب کے صوفیانہ خیالات کو سامنے رکھیے، سب میں یہی عجیب ہندی نے کار فرما ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندو باطنیت اور اسلامی تصوف باہم مل گئے ہیں۔ اسی طرح فچوہر، سیکری،

احمد آباد اور سری نگر کی عمارتوں میں، خیال اور دُسر پرد میں، منوہر اور عبدالصمد کی تصویروں میں امیر خسرو، رحیم، فیضی اور غالب کی شاعری میں یہ استزاجی لہر صاف نظر آتی ہے۔ یہاں امتیازات مٹ گئے ہیں اور فنون لطیفہ نے اپنے حدود کے اندر ہندوستانی لوح کو پایا ہے۔

ترکی ایرانی شاعری میں غزل کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ شاعر ایک حُدا ایک حیات ایک مہمات اور ایک حشر و نشر کے قائل تھے اور ادب میں غزل ایک ہی موضوع پر اپنی لامتناہی نگارنگی اور موزوں الفاظ اور مناسب قافیے کے انتخاب کے ساتھ ایک خاصے کی چیز تھی۔ مضمون کے لحاظ سے اس کا خود کفالتی انداز یا اقلیدسی نقش و نگار کی طرح ایک شعر کا دوسرے شعر سے صرف باہمی صوتی، عمیق، تعلق اسی شعور کا شاعرانہ اظہار ہے۔ یہ ذہن پُر شور ریگستانوں اور فلک نیلگوں کی پہنائیوں میں پلا اور بڑھا تھا چنانچہ نسیب کی شکل میں، غزل کی ابتدا، عربستان میں ہوئی ترقی ایران میں۔ لیکن وہ اپنے فقط کمال کو ہندوستان میں پہنچی۔ جہاں کی ریزہ کار فضا، کثرت میں وحدت کو دیکھ سکتی تھی اس قسم کی صنف اس کے مزاج اور طبیعت کے عین مطابق تھی۔ اس لیے غزل نے تمام ہندوستانی ادبیات پر اثر ڈالا اور خسرو، فیضی، عرفی و نظیری، طالب و کلیم، ظہوری و بیدل، میر و درد، مومن و غالب کے جوہر ہی سرزمین پر نمایاں ہوئے جن کی بدولت غزل اپنے منتہاے کمال پر پہنچ گئی اور یہ بات بھی نظر انداز کرنے کی نہیں ہے کہ غالب کے اختراعی کمالات کا اصلی میدان غزل ہی ہے نہ قصیدہ ہے نہ مثنوی، نہ مرثیہ نہ رباعی۔ قصیدے میں انھوں نے کہیں خاقانی کا متبع کیا ہے، کہیں سلمان و ظہیر کا، کہیں عرفی و نظیری کا۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ایک منزل کامیابی سے طے کی ہے لیکن وہ قصیدے کو عریض نویسی کا ایک رسمی ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ایک قصیدے کو معمولی تصرف کے ساتھ دو دو مہدوحین کے ملائے پیش کیا اور اس کو صرف وسیلہ روزگار سمجھا ہے۔ ان کی کوئی مثنوی فردوسی، رومی، نظامی یا جامی کے مقابلے پر پیش نہیں کی جاسکتی البتہ بعض بعض ٹکڑے بے مثل ہیں اور ہندی فارسی ادب کی آبرو۔

یہی صورت رباعی کی ہے کہ اس سرہائے کو فارسی کے رباعی گویوں سے کوئی بڑی نسبت نہیں۔ مولانا حالی نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ ”مرزا کے کلام میں غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔“

یہی ذہب ہے کہ غالب کو جو خیالات اور احساسات اپنے ورثے، اپنے ماحول اور اپنی مخصوص افتاد طبع کی بدولت ملے تھے ان کا جتنا خوب صورت اظہار غزل میں ہوا ہے وہ اور کسی صنف میں نہیں ہوا۔ ان کی تشبیہات استعارات و ترکیبات اپنے اندر جہان معنی چھپائے ہوئے ہیں، ان کے ذریعے غزل کا آرٹ نکھر گیا ہے اور زبان و بیان اپنی نئی بلندیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ ان دریچوں سے ہم غالب کی اس حسین معنویت، امتراجی بصیرت اور شوخ ذہانت کا نظارہ کر سکتے ہیں جو ایرانی ترکی ہندی خصوصیات کی نخل بندی کا نتیجہ ہے اور جو اردو کی سب سے بڑی دولت ہے۔ غالب نے غزل کے ذریعے صدیوں کی بھولی بھری یادوں اور خون گشتہ تمناؤں کو آب و رنگ شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے۔ نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے یا نشاط کار کو نصرتِ قلیل پر منحصر کیا ہے یا رخشِ عمر اور سوار کی بے اختیاری کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ یا وجودِ بحر کو نمودِ صورتِ پرستل سمجھا ہے یا اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے یوں دہائی دی ہے کہ لوحِ جہاں پر حرفِ مکر نہیں ہوں میں۔ یا تسلیم کی خواہش کرنے کی کوشش کی ہے یا اپنے مذہب کو یوں ظاہر کیا ہے کہ جب ملتیں ملت گئیں تو اجزلے ایماں ہو گئیں یا دوست کے سر انگشتِ حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھا ہے یا بہار کا اثبات اس طرح بھی کیا ہے کہ ہوئے مہر و مہ تماشا ئی یا چشم تنگ کو کثرتِ نظارہ سے دا کر نے کی صلاح دی ہے یا دنیا کو بازوِ بچہ اطفال سمجھا ہے یا یہ حسرت ظاہر کی ہے کہ بہت بکھلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم بختی۔ یا کوہِ طور کی سیر کا نیا دلولہ پیدا کیا ہے یا گرم فاری

کا یہ عالم دکھایا ہے کہ راستے کے تمام خس و خاشاک کے جلنے سے راہ گروں کے لیے راستہ صاف ہو گیا ہے۔ یادداشت اسکاں کو ایک نقشِ پاس سے تعبیر کیا ہے یا افراطِ شوق کو یوں ظاہر کیا ہے کہ فیثشہ خود بشکن برس سپمانہ ما۔ آگے جانے کی یہ جلدی ہے کہ سایہ و سرچشمہ یعنی طوبی و کوثر پر آرام گوارا نہیں یا رازِ نہاں دار پر کہنا چاہتا ہے، اور منبر پر نہیں۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ سر راستانے پر اور قدم بت کدے میں۔ اعزازِ نفس کا یہ حال ہے کہ دانے کی لالچ میں گرفتار ہونے کو تیار نہیں بلکہ یہ چاہتا ہے کہ نفس کو اتنا اونچا کیا جائے کہ وہ اس کے آشیاں تک پہنچ جائے مضبوط ہوش و خرد کا یہ عالم ہے کہ کیشِ مغاں پر غلبہ حاصل ہونے کی امید نہیں تو اس کا مذہب اختیار کرنے کو تیار ہے کہ اس طرح شرابِ جز یہ میں نہ آئے گی تو ہدیہ اور سوغات میں تو ضرور آئے گی۔ یا انسان کی بے بضاعتی اور مجبوری یہ کہ ہفت آسمان بگردش و مادر میان او۔ دوسرے الفاظ میں قیدِ حیات اور بندِ غم دونوں ایک ہیں اور جوشِ تمنائے دیدار کا یہ حال کہ وہ آنسوؤں کی طرح پلکوں کے راستے سے ٹپکا جاتا ہے تاہم آرزوؤں اور ارادوں کا وہ ہجوم کہ معشوق سے کہتا ہے کہ تو آتا کہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ہم دونوں مل کر بدل دیں اور حکمِ قضا کو رطلِ گراں کی گردش سے پھیر دیں اور اختلاط کے موقع پر ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں اور اس کو یکجائی کی اطلاع نہ ہونے دیں۔ یہ اور قسم کے خیالات، غالب کے یہاں بار بار ملتے ہیں جن میں زندگی کی حقیقتوں کا عرفان، اس کا نور و نکہت، جیسے کا سلیقہ اور حوصلہ سب ہی شامل ہے اور جو ان کے کڑھے ہوئے ذہن اور لپچے ہوئے جذبات کا نتیجہ ہیں۔

میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ ان خیالات کی گونج اُردو اور فارسی کے دوسرے شاعروں کے یہاں مطلق نہیں سنائی دیتی۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تیور، یہ رچاؤ، یہ انداز و اسلوب۔ یہ طرح داری، یہ نشاطِ معنوی دوسرے کے یہاں اس درجے میں نہیں ہے اور یہ بات اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کسی میں وسطِ ایشیا کی

ہم جوئی اور قوی العزمی، ایران کی رنگینی و لطافت اور ہندوستان کی تاب و پیش،
تحت الشعور میں ہم آمیز ہو کر شعر کے قالب میں ڈھل جائے۔ غالب کو خود اس معنوی
دراشت کا پورا احساس تھا جو کئی واسطوں سے گزر کر ان کو ہندوستان میں ملی تھی۔ فرماتے
ہیں کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کے فتوحات کے وقت عجم سے چھینا اس کے عوض میں مجھے
کہ میں بھی عجیبی الاصل ہوں کچھ نہ کچھ دیا۔ جب آتش کدہ ایران جل کر راکھ ہو گیا تو مجھے آتش
کی جگہ نفس یعنی زبان دی اور جب بت خانہ ڈھک گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی۔
شاہان عجم کے جھنڈوں کے موتی اتار لیے اور اس کے بدلے میں مجھے خامہ گنجینہ فشاں
عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھ کو شاعری میں قبال کیانی
مرحمت فرمایا۔ موتی تاج میں سے توڑ لیے اور علم و دانش میں جڑ دیے یعنی جو کچھ
علی الاعلان لوٹا تھا وہ مجھے سے دے دیا۔ آتش پرستوں سے جو شراب جزیے
میں لے لی وہ مجھے ماہ رمضان کی شب جمعہ کو بخش دی۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ پونجی
میرے اجداد سے لوٹی تھی اس میں سے صرف مجھے زبان و سر یاد کرنے کے
لیے بخش دی۔

مرزہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرا نم دادند
سوخت آتش کدہ ز آتش نفس بخشیدند
ریخت بتخانہ، ز ناقوس فغانم دادند
گہر از رایت شاہان عجم برچیدند
بعوض خامہ گنجینہ فشانم دادند
افراز تارک ترکان پشننگی بردند
بہ سخن ناصیہ فر کیا نم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
 ہرچہ بُردند بہ پیدای بہ نہانم دادند
 ہرچہ در جزئیہ ز گبران مے ناب آوردند
 بشب جمعہ ماہ رمضانم دادند
 ہرچہ از دستگہ یارس بہ یغما بُردند

تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند
 یوں تو ہندوستان پر ایران کا اثر دارا (DARIUS) کے زمانے سے شروع
 ہوتا ہے لیکن مغلوں کے زمانے میں ترکی ایرانی دھارے مل گئے تھے۔ ہندوستان
 کی خصوصیات کی آمیزش نے اس تہذیب کا حُسن ایسا نکھار دیا کہ ع
 دیکھ آئینے کو کہتی تھی کہ اللہ ری میں

غالب کے یہاں جو نشاطِ مطالب کا رقص اور لفظ کا حُسن ہے اس
 کا بھی سرچشمہ یہی ہے۔ ان کا انداز و اسلوب، ایرانی ہندی امتزاج کے
 اس نقطہ ارتقا کو ظاہر کرتا ہے جس کو تاریخِ عرصے سے طے کر رہی تھی اور جس کا
 فنِ تعمیر میں سب سے خوب صورت اظہار تاج محل کے مرمریں اور ہیرا تراش
 جسم میں نظر آتا ہے۔ غالب کی شاعری، افسون و افسانہ نہیں ہے، اس میں
 نفسِ گویم کی آمیزش ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو ہے، خونِ جگر کی
 کی نمود ہے۔ انھوں نے ہمیں نئے خیالات دیے ان کے ادا کرنے کا ایک نیا
 اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور اس
 میں مغلِ قلم کی شگفتگی ہے، اس کا پُر معنی اختصار ہے، اس کا ترکانہ بانچین ہے۔
 یہ انداز و اسلوب، حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے۔

غالب کے نظریہ حسن و عشق کی تعمیر میں بھی ان کی تمدنی دراشت، ان کی
 رنگارنگ شخصیت اور ان کی نسل اور ان کے خاندان کو بڑا دخل ہے۔ وہ محبوب
 کے وصل کو بہارِ تماشاے گلستانِ حیات سمجھتے ہیں۔ دیر و حرم کو آئینہٴ تکرارِ تمنا

اور عیشِ امروز کو زندگی کے لیے ضروری۔ انہوں نے جن سچائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ذہنی تجربہ یہ نہیں بلکہ تجربے اور جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث، مجازی مادی اور انسانی میں اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ مرزا غالب نے اس وقت، ہوش کی آنکھ کھولی جب مغلیہ سلطنت کی شمع بجھ رہی تھی۔ لارڈ لیک کی فوجیں دلی تک پہنچ گئی تھیں اور شہنشاہِ عالمِ عالمیان کی حکومت قلعہ معلیٰ تک رہ گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں یہ رقصِ شہر بھی ختم ہو گیا۔ نہ وہ تدرج باقی رہا نہ وہ ساقی لیکن غالب، ان حوادث کو اپنے دریاے بیتابی کی ایک موجِ خوں سمجھ کر برداشت کرتے رہے اور اس ظلمت میں انہوں نے زندگی کو سنبھالا اور سنوارا بھی۔

غالب اس تہذیبی سلسلے کی کردی ہیں جو ہمیں ازبکستان، ترکستان، تاجیکستان، افغانستان اور ایران سے ملاتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جب حضرت پیر و مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے جشنِ غالب کی بین الاقوامی تنظیم میرے سپرد کی تو مجھے یونسکو پیرس میں ڈاکٹر طہ حسین، ازبکستان میں ڈاکٹر شاہ اسلام محمدوف، روس میں پروفیسر غفوروف، اطالیہ میں پروفیسر بوسانی، انگلستان میں مسٹر الف رسل، چیکو سلواکیہ میں پروفیسر یان مارک، ایران میں آقائے صورت گز، کناڈا میں پروفیسر عبدالرحمان بارکر اور امریکہ میں پروفیسر شیل کے ہمנוا بنانے میں مطلق کوئی دشواری نہیں ہوئی اور ان سب کو میں نے مشرق سے مغرب تک غالب کا طرفدار ہی پایا۔

آخر وہ کیا چیز ہے جس نے غالب کو حلقہٴ شام و سحر سے نکال کر جادواں بنا دیا ہے میرے خیال میں وہ یہی ایشیائی ورثے کا تسلسل ہے جو ہمیں غالب کی انسان دوستی، آفاقیت، وسیع المشرتی، دردمندی،

بے نیازانہ خوش طبعی اور معنی لفظِ آدمیت کی شکل میں از سر نو دستیاب ہوا ہے۔ یہ وہی مشرق کے شعور کی رُو ہے جو قدیم و جدید اور خواب و حقیقت کی وادیوں کے درمیان بے پروائی اور رعنائی سے بہتی ہوئی اور نا آسودگی اور آرزو مندی کے گردابوں سے کھیلتی ہوئی عالمی ادب کے ماورائی سمندر سے جا ملتی ہے۔

غالب کا مقدمہ پیش

غالب کے ذہن کو سمجھنے کے لیے اُن اقتصادی دشواریوں کو ضرور سامنے رکھنا چاہیے جو میں وہ ۴۳ سال (یعنی کم و بیش ۱۸۶۶ء تا ۱۸۶۷ء) برابر مبتلا رہے اور جنہوں نے مرتے وقت تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان مالی پریشانیوں میں اُن کے مقدمہ پیش کو خاص طور پر دخل ہے جس کی اصلی شکل کا خلاصہ ہم نیشنل آرکائیوز نئی دہلی کے شکریے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

غالب کا مقدمہ پیش (خلاصہ) نیشنل آرکائیوز نئی دہلی ۱۹۰۱ء - ج ۱۔
 ایک رجسٹر جس میں متعدد درپوٹیں داخل ہیں۔ (نیشنل آرکائیوز - دہلی)
 ۱۔ چیف سکرٹری گوینٹ کی یادداشت بنام منری ٹھکانی پرنسپ سکرٹری گورنر جنرل آف انڈیا۔
 اس کے ہمراہ چیف سکرٹری بمبئی گوینٹ کی چٹھی مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۳ء اور ریزولوشن

دہلی کا خط جس میں غالب کے مقدمہ پیشن کا خلاصہ درج ہے ارسال کیے گئے ہیں۔
خط میں لکھا: "ہنگو دالس پریزیڈنٹ اس بات سے اتفاق نہیں کرنے کہ غالب کا خاندان
موجودہ پیشن سے زیادہ کا مستحق ہے۔"

۲۔ مسٹر جان مالکم کی یادداشت بنام چیف سکریٹری۔

اس کے ہمراہ گورنروں کی تحقیقات کی تفصیلی رپورٹ کی نقل مورخہ ۳ نومبر ۱۸۳۷ء
ارسال کی گئی ہے۔ یہ تحقیقات اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ سندر لارڈ لیک ہی
کے دستخط ثبت ہیں اور یہ کہ احمد بخش خان کا چال چلن شک و شبہ سے بالاتر تھا۔

۳۔ مسٹر جارج سوئٹن چیف سکریٹری کی یادداشت بنام ولیم مالکم پریزیڈنٹ دہلی۔

اس کے ہمراہ چیف سکریٹری بمبئی گورنمنٹ کے ایک مراسلے کی نقل بھیجی گئی ہے۔
مراسلے میں کہا گیا ہے کہ جس پروانہ پر لارڈ لیک کی مہربے و وصیج معلوم ہوتا ہے نیز یہ
ہدایت کی گئی ہے کہ اس پروانہ کو نواب شمس الدین خاں کو واپس کر دیا جائے۔

۴۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ کی یادداشت مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۳۷ء غالب کے پیشن
کے معاملے کے بارے میں۔

اس میں کہا گیا ہے کہ نصر اللہ بیگ (بیگ) خاں نے جنو اب احمد بخش خاں الی ریاست
فیروز پور کا داماد تھا۔ مرنے پر ماں ایک بیوہ تین بہنیں اور دو لڑکے (بھتیجے) چھوڑے
خواجہ حاجی نصر اللہ بیگ خاں کے باپ کی بیوی کی بھتیجی کا لڑکا تھا اور نصر اللہ
بیگ خاں کے معاملات کا انتظام اس کے سپرد تھا۔ اس کی (نصر اللہ بیگ خاں)
وفات پر نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے اپنی جائیداد کے متعلق پروانہ معافی
حاصل کر لیا۔ شرط یہ تھی کہ نواب احمد بخش خاں نصر اللہ بیگ خاں کے ورثہ کے
لیے مدد معاش مہیا کرے گا۔ نواب نے ناجائز طور سے خواجہ حاجی کو متوفی کے خاندان
کا اہم ترین فرد بنا دیا۔ اور اس کے لیے دو ہزار روپیہ سالانہ اور باقی تین ہزار
سالانہ نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور غالب کے خاندان کی گزراوقات کے
لیے مقرر کر لیے۔ نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ کی وفات پر ان کا حصہ ان کی سب سے

بڑی لڑائی کو ملا جس نے اپنی دو چھوٹی بہنوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ اس انتظام میں غالب کے بھائی مرزا یوسف کے لیے کوئی رقم نہیں رکھی گئی تھی۔ یادداشت میں غالب کے ۱۸۲۸ء میں کلکتہ جانے اور ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کو پرنسین سکرٹری کی خدمت میں، اپنی عرضداشت پیش کرنے کا بھی ذکر ہے۔

غالب کا پنشن کیس

۷۸۹

فان ۱۸۳۱ رڈ پارٹمنٹ پولیٹیکل

نیشنل آرکائیوز - دہلی

۲۲ اپریل نمبر ۱۰۸

غالب کی درخواست بنام جارج سوئٹن سکرٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم معرو ہے کہ مبلغ دس ہزار سالانہ پنشن کے لیے ان کے حق کو تسلیم کیا جائے اور یہ رقم فیروز پور کے جاگیردار کی جاگیر (جس کی مالیت مبلغ ۲۵ ہزار ہوتی ہے) پر واجب الادا قرار دی جائے۔ وہ یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ وہ دستاویز جس کے اندر مبلغ ۵ ہزار دینا طے ہوئے ہیں اور جسے فریق مخالف (نواب احمد بخش خاں) کی جانب سے داخل کیا گیا ہے۔ عرضی گزار کے پنشن کا پورا حق پاتے ہیں (جو مبلغ دس ہزار سالانہ ہوتا ہے) مانع نہیں ہونا چاہیے اور بہتر ہوگا کہ یہ پنشن براہ راست سرکاری خزانے سے ادا کی جائے۔

غالب کا پنشن کیس

۱۰۹۳

نیشنل آرکائیوز، دہلی

کورٹ ریکارڈ بابت ۱۸۳۳ء کی نقل

موضوع یکم ستمبر ۱۸۳۲ء صفحات ۹۹۔ (نیز کچھ سادہ صفحے)

۱۸۳۲ء کا کورٹ ریکارڈ گورنمنٹ آف انڈیا کے مختلف افسران کی یادداشتوں اور رپورٹوں پر مشتمل ہے جو غالب کے مقدمہ بابت اضافہ پنشن کے مختلف پہلوؤں کے سلسلے میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام ارسال کی گئی تھیں۔

- ۱۔ بنام مسٹر ہنری تنوہی پرنسپ سکریٹری گورنر جنرل صفحات ۱-۳
- ۲۔ بنام چیف سکریٹری سپریم گورنمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۵-۷
- ۳۔ چیف ریزیڈنٹ دہلی صفحات ۱۰-۱۰ مورخہ ۳ اکتوبر ۱۸۳۱ء
- ۴۔ اسد اللہ خان کے مقدمہ میں چیف سکریٹری کا نوٹ صفحات ۱۳-۲۶
مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۳۱ء
- ۵۔ بنام این بی ایڈمنسٹن اسکوٹر صفحات ۲۹-۳۵ (نواب احمد بخش خاں کے حق میں
فارسی پروانہ کا انگریزی ترجمہ صفحہ ۳۵-۳۸)
- ۶۔ بنام نفینٹ کرنل مالکم۔
- ۷۔ بنام ایل۔ بی ایڈمنسٹن صفحات ۴۹-۵۲
- ۸۔ بنام جارج سوئٹن چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۵۳-۵۴
- ۹۔ پھٹی ہوئی فارسی دستاویز۔ خواجہ حاجی وغیرہ مرقوم باہ جون ۱۸۰۶ء مطابق ۱۹
ربیع الاول ۱۲۳۱ء
- ۱۰۔ درخواست اسد اللہ خاں بخدمت رائٹ آنریبل لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل ان
کونسل کلکتہ۔ صفحات ۵۹-۶۴
- ۱۱۔ بخدمت لارڈ ولیم کیونڈش گورنر جنرل آف انڈیا صفحات ۶۵-۶۸
- ۱۲۔ بنام ایس فریزر۔ ڈپٹی سکریٹری ٹو گورنمنٹ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ فورٹ ولیم
صفحات ۶۹-۷۰ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۳۱ء
- ۱۳۔ آخر میں ”دستخط محمد اسد اللہ خاں برادرزادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیر سونک سونا“
بخدمت لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل آف انڈیا فورٹ ولیم صفحات ۷۱-۷۲
- ۱۴۔ بنام سی۔ نورس چیف سکریٹری ٹو بمبے گورنمنٹ صفحات ۸۵-۸۶ مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۳۱ء
- ۱۵۔ بنام جارج سوئٹن چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ۔ فورٹ ولیم۔ صفحات ۸۹-۹۰
مورخہ ۲۴ نومبر ۱۸۳۱ء
- آخر میں ”عرضداشت محمد اسد اللہ خاں برادرزادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیر دار

سونک سونا۔ بست و بفتح نمبر ۱۸۳۱ء

۱۶۔ بنام جارج سوئٹن چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ فورٹ ولیم۔ صفحات ۹۳-۹۴

مورنہ ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء

۱۷۔ از اسد اللہ خاں بخدمت رائٹ آنریبل گورنر جنرل صفحات ۹۵-۹۸

غالب کا پنشن کیس

۷۹۱

نیشنل آرکائیوز، دہلی

فارن - ۱۸۳۳۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۱۳ اپریل ۸۰-۱

غالب کی درخواست بنام مسٹر سوئٹن چیف سکریٹری

یہ درخواست ان خدمات پر مشتمل ہے جو اہل برطانیہ کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پیشتر ان کے باپ اور چچا نے انجام دی تھیں۔ موخر الذکر برطانوی حکمرانوں کی جانب سے آگرہ کا حاکم تھا۔ سائل اس بات کی درخواست کرتا ہے کہ جو واقعات اس نے اپنی عرضی میں بیان کیے ہیں سرکاری ریکارڈ سے ان کی تصدیق کی جائے۔ زان بعد اس سلسلے میں اسے ضروری سند (سرٹیفکیٹ) عنایت کیا جائے۔

۲۔ غالب کی درخواست بنام مسٹر سوئٹن چیف سکریٹری

اس میں کہا گیا ہے کہ ۴ مارچ ۱۸۳۱ء کو برطانوی حکومت نے ان بچاس سواروں کا چارج جو اس سے پیشتر اس کے مرحوم چچا کی کمان میں تھے۔ فیروز پور کے جاگیردار نواب احمد بخش خاں کو دیا تھا۔ وہ درخواست کرتے ہیں کہ فیروز پور کی جاگیر میں ان کے حق کی رقم کا تعین کیا جائے۔

غالب کا پنشن کیس

۷۹۳

نیشنل آرکائیوز، دہلی

فارن - ۱۸۳۶۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۵ دسمبر نمبر ۱۵۹-۶۱

۱۔ درخواست غالب بنام ڈبلیو ایچ میکناٹن سکرٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم چونکہ لفٹنٹ گورنر آگرہ نے ان کی درخواست کو از روئے شفقت ملاحظہ نہیں فرمایا اور گورنر جنرل نے ان کے فیصلے کو بحال رکھا ہے لہذا معروض ہے کہ سائل کے معاملے کو یا تو صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے پاس منتقل کر دیا جائے یا انگلستان بادشاہ سلامت باجلاس کونسل کے حضور میں ارسال کر دیا جائے۔

۲۔ درخواست غالب بخدمت لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل آف انڈیا۔ فورٹ ولیم سکرٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سے اس بات کی اطلاع پانے پر کہ ان کا دعویٰ خارج کر دیا گیا ہے غالب کی گورنر جنرل کے حضور میں معروض ہے کہ
۱۔ انھوں نے لفٹنٹ گورنر آگرہ کے فیصلے کے خلاف سات نکات کا اعتراض داخل کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ ان کے جوابات ان سے (لفٹنٹ گورنر سے) مانگے جائیں۔

۲۔ اگر ان استفسارات کے جوابات آجائیں تو ان کی ایک نقل درخواست گزار کو مرحمت کی جائے لیکن اگر اس کی (جواب منگانے کی) ضرورت نہ سمجھی جائے تو ان کے بارے میں درخواست گزار کو مطمئن کیا جائے۔

۳۔ لہذا اب وہ ملتمس خدمت ہے کہ اس کے معاملے کو صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے فیصلے کے لیے بھیج دیا جائے لیکن اگر عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف ہو تو اسے ان وجوہ کے متعلق مطمئن کیا جائے جن کی بنا پر اس کا دعویٰ خارج کیا گیا ہے۔

۴۔ مزید برآں معروض ہے کہ اگر گورنر جنرل اس کے معاملے کو صدر دیوانی عدالت میں نہ بھیجے گا فیصلہ کریں تو اس معاملے سے متعلق جملہ کاغذات انگلستان بادشاہ سلامت باجلاس کونسل کے فیصلے کے لیے بھیج دیئے جائیں۔

ملفوف جملہ کاغذات متعلقہ مقدمہ نیز مرقوم الصدر مکاتیب
نوٹ : اس درخواست کے جواب میں غالب کو سکرٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کلکتہ کی جانب سے یہ اطلاع ملی کہ ان کے کاغذات کورٹ آف ڈائریکٹرس کو بھیجے جا رہے ہیں۔

غالب کا پنشن کیس

۷۹۷

فارن - ۱۸۳۷ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

نیشنل آرکائیوز - دہلی

۱۷ اپریل نمبر ۶۶ - ۶۷

۱۔ درخواست غالب بنام ڈبلیو ایچ میکناٹن سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا
فورٹ ولیم۔

معروض ہے کہ مبلغ ۲۰۳۰۰ روپیہ کا جو اس کا بقایا واجب الادا ہے مرحوم
شمس الدین خاں کے ترکہ کے مبلغ ۲۶۰۰۰ روپیہ میں سے جو گورنمنٹ کے پاس جمع ہیں
وضع کر لیا جائے اور شمس الدین خاں کی جائیداد کی فروختی سے سائل کا پچھلا پنشن
کا بقایا بحساب مبلغ ۳۰۰۰ سالانہ تا اختتام اپریل ۱۸۳۵ء دلویا جائے نیز کورٹ
آف ڈائریکٹرز کے فیصلے تک اسے ۳۰۰۰ روپیہ سالانہ کی پنشن بلانا عہدہ ادا
کرائی جائے۔

۲۔ غالب کے خط کے جواب میں سکریٹری گورنمنٹ نے ان کے مراسلہ
قصیدہ فارسی کے بارے میں گورنر جنرل کی جانب سے اظہارِ خوشنودی کیا ہے۔

غالب کا پنشن کیس

۷۹۸ - ۸۰۰

فارن - ۱۸۳۷ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۸ اگست نمبر ۹۳ - ۹۵

۱۔ مسٹر ایچ میکناٹن سکریٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا کے نام غالب کا وضاحتی
مکتوب جس میں ان کے مقدمہ پنشن سے متعلق جو کورٹ آف ڈائریکٹرز کے
زیر سماعت تھا کچھ مزید معروضات درج ہیں۔

۲۔ غالب کی درخواست بخدمت لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل ان کونسل فورٹ ولیم۔
(لفظ: دوہزار روپیہ سالانہ وظیفہ جو پہلے خواجہ حاجی کو اور اس کے بعد اس کے

ورثا کو ملتا تھا اس کے خلاف اپیل ہے۔

ب : اگرچہ اس کے معاملہ سے متعلق تمام کاغذات داخل کیے جا چکے ہیں پھر بھی معاملہ کی صورت حال کا اختصار ضروری ہے اور سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ج : جبکہ چار سو سواروں کا رسالہ جو میرے چچا کی ماتحتی میں تھا توڑا گیا تو اس میں سے پچاس سوار منتخب کر کے نواب احمد بخش خاں کی ماتحتی میں دے دیئے گئے جو خوالد کر نے خواجہ حاجی کی خدمات کو جو قدیم رسالے میں سب سے پرانا انفرم تھا برقرار رکھا اور اسے ان پچاس سواروں کا انفرم کر کیا۔ خواجہ حاجی محض ایک ملازم کی حیثیت رکھتا تھا جسے جملہ پندرہ ہزار سالانہ کی رقم میں سے جو سواروں کی نگہداشت کے واسطے منظور ہوئی تھی مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ کا الاؤنس ملتا تھا۔

خواجہ حاجی کی وفات پر اس کا منصب سابقہ شرائط کے مطابق اس کے لڑکوں کو دے دیا گیا۔ لیکن جب نواب احمد بخش خاں کی جاگیر ضبط ہوئی اور پچاس سواروں کا رسالہ توڑ دیا گیا تب بھی تعجب ہے کہ خواجہ حاجی کے وارثوں کے لیے دو ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ برقرار رکھا گیا۔ اگرچہ مناسب بات یہ تھی کہ خواجہ حاجی کے ورثا کو ان کے خاندان کی خدمات شایستہ کے پیش نظر کچھ پنشن دے دی جاتی۔

د : مزید برآں اس میں میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے لیے جاگیر کی آمدنی مبلغ ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ ملے ہوئے تھے۔ یہ پورے کا پورا وظیفہ میرے چچا کے وارثوں کو ملنا چاہیے تھا اور اس میں خواجہ حاجی اور اس کے وارثوں کا کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے تھا بشرطیکہ موجودہ فیصلہ لارڈ لیک کی رپورٹ مورخہ ۴ مئی ۱۹۵۷ء کی بنیاد پر کیا جائے لیکن اگر کورٹ آف ڈائریکٹرز کا فیصلہ فارسی شفق پر مبنی ہو تب بھی میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے ورثا ہی پانچ ہزار روپیہ سالانہ پنشن کے مستحق ہیں۔ خواجہ حاجی کی زندگی میں مبلغ پانچ ہزار روپیہ سالانہ میں سے جو میرے چچا کے ورثا کے لیے مقرر ہوئے تھے اسے دو ہزار سالانہ کا وظیفہ دینے کی شاید کوئی توجیہ ہو سکے مگر اس کے وارثوں کو اس رقم

(مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ) پر استحقاق جتانے کا کوئی حق نہیں ہے کیوں کہ ان کا نصر اللہ بیگ خاں کے خاندان سے جو اس خاندان کے مورث اعلیٰ تھے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لہذا معروض خدمت ہے کہ خواجہ حاجی کے وارثوں کا دو ہزار سالانہ کے لیے استحقاق کا دعویٰ باوجود ایفینٹ گورنر کے سابقہ فیصلے کے جو ان کے حق میں تھا نامنظور کیا جائے اور اگر انھیں کوئی وظیفہ ملنا ہی ہے تو وہ انھیں اصل پندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم میں سے دیا جائے جو رسالے کی نگہداشت کے واسطے مقرر ہوئی تھی۔

۳۔ ڈبلیو ایچ آفیشنگ چیف سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا فورٹ ولیم کی رپورٹ بابت اس امر کے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد کن وجوہ کی بنا پر نواب احمد بخش خاں کو پندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم معاف کی گئی تھی۔

۴۔ فارسی شقہ لاؤڈیک نے، رجون سہ کو لکھا تھا اور جس کے اندر نصر اللہ بیگ خاں کے ورثا کو مبلغ پانچ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ دیا گیا تھا اور جس میں سے مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ خواجہ حاجی کے واسطے متعین کیے گئے تھے۔

۵۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کی چھٹی مرنہ ۲۸ اگست ۱۸۴۳ء بنام مرزا غالب جس میں انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ آئندہ جملہ درخواستیں اور کاغذات وغیرہ صرف ایفینٹ گورنر آگرہ ہی کے توسط سے بھیجا کریں۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۳-۸۰۵

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

فان ۱۸۴۲۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۹ رجون۔ نمبر ۱۲۸-۳۰

۱۔ غالب کی چھٹی مرنہ ۲۰ مئی ۱۸۴۲ء بنام ٹی ایچ میڈوک چیف سکریٹری

ٹو گورنمنٹ آف انڈیا۔ الہ آباد

معروض ہے کہ ملفوفہ یادداشتیں جو اس کے اضافہ پنشن کی درخواست اور قصیدہ فارسی (جس کے اندر گورنر جنرل کی مدح سرائی کی گئی ہے) کے متعلق ہیں۔ لارڈ بہادر کی خدمت میں پیش کر کے ان پر موصوف کے احکام حاصل کر لیے جائیں۔ غالب یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ حسب سابق آئندہ بھی انھیں اپنی معروضات اور خطوط براہ راست بذریعہ ڈاک بھیجنے کی اجازت دی جائے۔

۲۔ ملفوفہ یادداشت مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۴۲ء بمخدمت لارڈ ڈیڈن براگورنر جنرل آف انڈیا میں اپنے دعوائے اضافہ پنشن سے متعلق خاص نکات پر زور دیا ہے اور عرض کیا ہے کہ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں اپنی زندگی میں ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر پر جو انھیں برطانوی سرکار کی طرف سے مرحمت ہوئی تھی، قابض تھے اور اس کے بالعوض چار سو سواروں کا رسالہ تیار رکھتے تھے۔ ان کی وفات پر ان کی جاگیر حکومت نے واپس لے لی۔ اور رسالہ توڑ دیا گیا۔ پھر بھی لارڈ لیک نے اپنی رپورٹ مورخہ ۴ مئی ۱۸۴۲ء میں مرحوم کے خاندان کے لیے مبلغ دس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن کی سفارش کی۔ اس رقم کی ادائیگی نواب احمد بخش خاں کے ذمہ کی گئی۔ غالب کا بیان ہے کہ نواب صاحب نے ان کے خاندان کو مبلغ دس ہزار سالانہ میں سے صرف تین ہزار روپیہ سالانہ دیے اور بعد میں نواب صاحب کے ورثا بھی یہی رقم دیتے رہے۔ شمس الدین خاں کے قتل کے بعد فیروز پور بھڑکے کی جائیداد حکومت نے ضبط کر لی۔

۱۸۲۸ء میں مقدمہ اس وقت کے پریزیڈنٹ ڈبلیو۔ بی۔ بیلی کے تصفیے کے لیے دائر کیا گیا اور چار سال بعد لارڈ ڈیڈننگ نے اسے خارج کر دیا۔ ۱۸۳۸ء میں مرزا غالب نے اس معاملے کو پھر کورٹ آف ڈائریکٹرس کی نظر ثانی کے لیے پیش کیا۔ غالب عرض کرتے ہیں کہ پانچ سال گزر گئے مگر ہنوز کورٹ آف ڈائریکٹرس نے اپنے انقطاعی فیصلہ کا اعلان نہیں کیا۔ سائل اس بات کی بھی درخواست کرتا ہے کہ اسے اپنا پورا وظیفہ لینے کی اجازت عطا کی جائے اور چونکہ نئے گورنر جنرل کو پچھلے گورنر جنرل کے مقابلے میں زیادہ اختیارات عطا کیے گئے ہیں، سائل کی درخواست کو شرف قبول

بخشا جائے۔

۳۔ ٹی ایچ میڈوک سکریٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا کی جیٹھی بنام مرزا غالب۔

ٹی ایچ میڈوک لکھتے ہیں کہ :

پنشن اور وظیفہ وغیرہ کا فیصلہ سابق گورنمنٹ کرپن میں جن کی کورٹ آف ڈائریکٹرس نے پورے طور پر توثیق کر دی ہے۔ آخر میں یہ اطلاع دی ہے کہ لارڈ صاحب اس موضوع پر کوئی اور درخواست قبول نہیں کر سکتے۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۶ - ۸۰۷

نیشنل آرکائیوز - دہلی

فارن ۱۸۴۲ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۶ جولائی نمبر ۱۳۲ - ۴۴

۱۔ غالب کی جیٹھی مورخہ ۵ جون ۱۸۴۲ء بنام ٹی ایچ میڈوک سکریٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا۔

درخواست کرتے ہیں کہ ملفوف یادداشت کو مع اصل فارسی خط کے جو سکریٹری نے گورنر جنرل کو بھیجا تھا موخر الذکر کے ملاحظہ کے واسطے پیش کر دیں۔ غالب یہ بھی کہتے ہیں کہ ہنوز کورٹ آف ڈائریکٹرس کے یہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

۲۔ ملفوف یادداشت مورخہ ۵ جون ۱۸۴۲ء بخدمت لارڈ ایلن براگورنر جنرل ٹی ایچ میڈوک کی تحریر مورخہ ۳۰ مئی ۱۸۴۲ء کے جواب میں معاملہ زیر بحث کے واقعات قلم بند کرتے ہیں جس میں (مسٹر میڈوک کی تحریر میں) اطلاع دی گئی ہے کہ اس بارے میں اور کوئی درخواست برائے ملاحظہ منظور نہ کی جائے گی۔

غالب کہتے ہیں کہ چونکہ وہ سابقہ گورنمنٹ کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھے اس لیے انہوں نے لارڈ صاحب کے پیشرو سے درخواست کی تھی کہ ان کے معاملے کو کورٹ آف ڈائریکٹرس کے ملاحظہ کے لیے بھیج دیا جائے۔ یہ استدعا ۱۸۴۳ء میں منظور ہوئی۔ دو سال بعد غالب نے کورٹ آف ڈائریکٹرس کے فیصلے کے بارے میں دریافت کیا تو

انہیں اطلاع دی گئی کہ یہ معاملہ ۸ مئی ۱۹۴۳ء کو وہاں بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۳ء تک کئی جواب موصول نہیں ہوا۔ لیکن سکرٹری میڈوک کے خط سے معلوم ہوا کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے سابق گورنمنٹ کے فیصلے کو بحال رکھا ہے غالب اب گورنر جنرل سے درخواست کرتے ہیں کہ اس فیصلے کی ایک نقل مع اس کی تاریخ کے انہیں مرحمت فرمائی جائے۔

۳۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کی چھٹی مورخہ ۷ فروری ۱۹۴۳ء کا اقتباس :

”اسد اللہ خاں کا دعویٰ مناسب وجوہ کی بنیاد پر خارج کر دیا گیا ہے۔“

یہ اقتباس غالب کو ایک وضاحتی چھٹی مورخہ ۱۵ جون ۱۹۴۳ء (جس پر ٹی ایچ میڈوک کے دستخط ہیں) کے ذریعہ بھیجا گیا۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۸ لغایت ۸۰۹

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

۲۸ دسمبر ۱۹۴۰ء نمبر ۲۸۰-۸۳

۱۔ غالب کی چھٹی مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء بنام ٹی ایچ میڈوک سکرٹری میڈوک گورنمنٹ درخواست ہے کہ ملفوف عرضی کو گورنر جنرل کے ملاحظہ کے واسطے پیش کر دیں اور جس تاریخ کو یہ عرضداشت انگلستان ارسال کی جائے اس سے مطلع فرمائیں۔

۲۔ ملفوف درخواست بخدمت لارڈ ایلن براگورنر جنرل مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء درخواست ہے کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے فیصلے کے خلاف اس کی درخواست اپیل کو برعکس ملکہ مغظمہ کے پاس روانہ فرمائیں۔

۳۔ ٹی ایچ میڈوک کی چھٹی مورخہ ۵ اگست ۱۹۴۲ء گورنر نے سائل کی عرضداشت کو کورٹ آف ڈائریکٹرز کے پاس پہلی ڈاک سے بھیجنا منظور کر لیا ہے۔

۴۔ مرزا غالب کی چھٹی مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء بنام ٹی ایچ میڈوک۔
شکر پور کے ساتھ مکتوب الیہ کی چھٹی مورخہ ۵ اگست ۱۹۴۲ء کی

رسید دی ہے۔

غالب کا پنشن کیس

فارن ۱۸۴۴- ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۳ نومبر نمبر ۶۰-۶۱

- ۱- کورٹ آف ڈائریکٹرس کے مکتوب مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۸۴۳ء کا اقتباس جو غالب کو بھیجا گیا۔
”یہ یادداشت کمیشن برائے تحقیق احوال ہندوستان کے پاس بھیج دی گئی ہے۔“
- ۲- غالب کی چٹھی بنام آئی۔ کری سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔
معروض ہے کہ ملفوف یادداشت گورنمنٹ آف انڈیا کے ملاحظے کے لیے پیش کر دی جائے۔

دستخط

رقیمہ نیاز امیدوار لطف و کرم

اسد اللہ

- ۳- غالب کی درخواست مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۸۴۳ء بمقامت سربراہ ہندوستان ہارڈنگ گورنر جنرل معروض ہے دو سال ہوئے کہ انھیں سرٹی-ایچ میڈوک سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے مطلع کیا تھا کہ غالب کی یادداشت کورٹ آف ڈائریکٹرس کو بھیج دی گئی ہے لیکن ہنوز اپنے معاملے کے متعلق انھیں (غالب کو) اس کا جواب نہیں ملا۔
- ۴- فارن ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم کی چٹھی مورخہ ۲۹ نومبر ۱۸۴۳ء
کورٹ آف ڈائریکٹرس کے یہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا اور یہ کہ ان کی موجودہ درخواست کی ایک نقل ان کے (کورٹ آف ڈائریکٹرس) پاس بھیج دی جائے گی۔

غالب کا پنشن کیس

۸۱۲ - ۸۱۳

نیشنل آرکائیوز-دہلی

۱۰ فروری نمبر ۲۹۱-۲۹۳

- ۱- غالب کی چٹھی بنام مشراب ڈورڈ سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔
اس ملاقات کی یاد دہانی کی گئی ہے جو ان سے دہلی میں ہوئی تھی اور مزاج پرسی کی گئی ہے۔

۲۔ غالب کی چٹھی بنام مسٹر کری سکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔
گورنر جنرل کے ملاحظے کے لیے اپنی درخواست کو ملفوف کیا ہے اور یہ امید کی گئی
ہے کہ ان پر وہی کرم فرمائی جاری رہے گی جو مکتوب الیہ کے پیشروؤں سوسنٹن پر نسیب
اسٹرنگ میکناٹن اور میڈوک نے مبذول فرمائی تھی۔

۳۔ غالب کی درخواست بخدمت لارڈ ایلن براگورنر جنرل۔
معروض ہے کہ گورنر جنرل کے دورہ الہ آباد کے موقع پر انھیں (غالب کو) بتایا
گیا تھا کہ کورٹ آف ڈائریکٹرس نے گورنمنٹ آف انڈیا کے فیصلے کو بحال رکھا ہے اس
پر انھوں نے (غالب نے) ایک اور اپیل ہرجسٹی ملکہ معظمہ کی خدمت میں روانہ کی تھی۔
۵ اگست کو سائل کو مطلع کیا گیا کہ ان کا معاملہ انگلستان بھیج دیا گیا ہے۔ اسے ۱۸ جینے گزر
گئے لیکن انھیں کوئی جواب نہیں ملا۔ اس درخواست پر ۲۶ جنوری ۱۸۴۳ء کی تاریخ
پڑی ہے۔

۴۔ سکرٹری گورنر جنرل کی چٹھی مورخہ ۵ اگست ۱۸۴۲ء
اطلاع دی گئی ہے کہ غالب کی یادداشت اگلی ڈاک کے ذریعہ کورٹ آف
ڈائریکٹرس کے پاس بھیج دی جائے گی۔

۵۔ مسٹر آئی کری سکرٹری گورنر جنرل کی چٹھی مورخہ ۳ فروری ۱۸۴۳ء
اطلاع دی گئی ہے کہ ہنوز انگلستان کی سرکار کے یہاں سے کوئی جواب موصول
نہیں ہوا۔ غالب نے ان دونوں مذکورہ صدر چٹھیوں کی نقول اپنی درخواست مورخہ
۲۶ جنوری ۱۸۴۳ء بخدمت گورنر جنرل کے ساتھ ملفوف کر دی تھی۔

غالب کا پنشن کیس

۸۱۵ - ۱۶
نیشنل آرکائیوز - دہلی

فارن ۱۸۵۶ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۱۹ دسمبر نمبر ۸۳ - ۵

۱۔ تحریر مورخہ ۸ دسمبر ۱۸۵۶ء بنام بی پی ایڈمنٹن - سکرٹری گورنر جنرل

آف انڈیا باجلاس کونسل فورٹ ولیم۔

ملفوف درخواست اور منسلکہ کاغذات پیش کرتے ہوئے غالب التماس کرتے ہیں کہ انھیں گورنر جنرل کے ملاحظے کے واسطے پیش کر دیا جائے اور ازراہ نوازش اس کی غالب کو اطلاع دی جائے۔

رقیمہ اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں

جاگیر دار سونک سونا

مرقوم ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی

۲۔ درخواست بخدمت جان وائیکائونٹ کیننگ گورنر جنرل باجلاس کونسل۔

غالب سر جارج کلرک کی ایک چٹھی اپنی درخواست کے ہمراہ ملفوف کرتے ہوئے اس بات کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ آیا ان کا معاملہ بہر مجسٹی ملکہ منظمہ کی خدمت میں ۱۸۵۶ء کو ارسال کر دیا گیا ہے جیسا کہ انھیں اطلاع دی گئی تھی۔

عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں

جاگیر دار سونک سونا

معروضہ ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی

۳۔ نقل حکم گورنر جنرل

اس کے ہمراہ جارج کلرک کی چٹھی کو واپس کیا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ جب کورٹ آف ڈائریکٹرز کا فیصلہ وصول ہوگا اس سے غالب کو مطلع کیا جائے گا۔

غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات

حضرت غمگین کے ناہ

مرزا غالب کے مکتوب الہم میں حضرت غمگین کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ غالب نے ان کی رباعیات کے متواتر لکھا ہے کہ انھوں نے ذرے کو آفتاب اور کوئی میں دریا کو بند کر دیا ہے اور ان کے دیوان رباعیات بس وہ مطالب پوشیدہ ہیں جو شبنوی مولانا دوم میں بھی نہیں ملے۔ ان رباعیات کا خطی نسخہ مکاشفات الاسرارؒ انڈیا آفس لاہور بری لندن میں موجود ہے۔ بلورم ہارٹ نے اس کا تعارف مندرجہ ذیل الفاظ میں کر دیا ہے:

"یہ سید علی دہلوی المعروف یہ حضرت جی المتخلص بہ غمگین کی تصنیف ہے۔ ان رباعیات کا دیوان ہے۔ اس کے فارسی مقدمہ میں مصنف نے اپنے حالات لکھے ہیں جن کی ابتدا ان اردو اشعار سے ہوتی ہے:

لے رقعات غالب غمگین اعلیٰ غمگین اکادمی گوالیار خط نمبر،

لے مکاشفات الاسرار: انڈیا آفس لاہور بری لندن نمبر اردو ۱۱۵

لے نہایت ہندوستانی مخطوطات (۱) انڈیا آفس (ترتیب بلورم ہارٹ ص ۱۹) مطبوعہ ۱۹۶۶ء۔ نیز مکاشفات الاسرار: نسخہ لندن دہلی ۱۹۶۶ء۔

ایک عمر ہی میری اللہ کی جنگ دیتا یں رہا شکست سو سو فرنگ
 غمگین مغلوب اب ہوا ہوں ایسا نہ فوج رہی نہ میں نہ وہ نام و ننگ
 فارسی مقدمے کی ابتدا کے الفاظ یہ ہیں :

”حامد ا بعد حمد حقیقت و نعت صورت خود، سید علی عرف حضرت جی مخلص
 غمگین منوطن و ملی قادری نقشبندی ابو العلاء المشرب مجملًا از احوال خود
 بغرض احباب صفوت انساب می رساند۔“

شروع کی رباعیوں میں بسم اللہ کی تفسیر ہے۔ ابتدا کا شعر ہے :

بسم اللہ میں سب ہے جو کہ قرآن میں ہے

قرآن میں وہ ہے جو کہ انسان میں ہے

(حضرت) سید علی دہلوی گوالیار کے ساکن تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد تھا۔ جو
 دہلی کے گورنر شاہ نظام الدین احمد قادری (تلمیذ رنگین) کے جتنیے تھے غمگین کے والد کا
 انتقال اس وقت ہوا جب اول الذکر کی عمر بارہ برس کی تھی۔ ۲۵ برس کی عمر میں درویشی
 اختیار کی اور سید فتح علی رضوی سے بیعت ہوئے۔ اس کے بعد گوالیار سے پٹنہ اور پٹنہ
 سے گیا کا سفر کیا۔ گیا میں ان کو حضرت شاہ ابو البرکاتؒ کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔
 جن کے مشورے سے وہ بارہ برس تک پٹنہ میں رہے۔ یہاں انھوں نے خواجہ ابوالحسین
 سے فیض باطنی حاصل کیا اور ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ حضرت غمگین نے
 خواجہ ابوالحسین اور سید فتح علی دونوں کے سلسلے بھی بیان کیے ہیں :

”مکاشفات الاسرار کا یہ دیباچہ برہان پور میں لکھا گیا تھا جب غمگینؒ کی

عمر ساٹھ برس کی تھی۔ اس کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس سے

قبل وہ ایک دیوان مرتب کر چکے تھے جس میں ان کی زندگی کے کچھ حالات

درج ہیں۔ اسی کے بعض اشعار دیوان مکاشفات الاسرار میں شامل کر دیے

ہیں جو انھوں نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے لیے مرتب کیا تھا۔ یہ

نسخہ مصنف کا دستخطی معلوم ہوتا ہے.....“

یہاں بلوم ہارٹ نے غالب پر ڈیڑھ سطرے حاشیے میں دو فاحش غلطیاں کی ہیں۔
 لکھا ہے کہ ان کا انتقال کلکتہ میں اور ۱۸۷۲ء میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں
 صحیح نہیں۔

مکاشفات الاسرار میں حضرت غمگین نے اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس لیے
 دیباچہ اہمیت سے خالی نہیں۔ یہاں اس کے چند اہم حصے نقل کیے جاتے ہیں :
 ”بجملہ از احوال خود بغرض احباب صفوت انتساب می رساند کہ ایں فقیر ابن
 سید محمد بن سید احمد سید شاہ پیر بن سید محی الدین بن سید شیر محمد القادری کہ
 در برہان پور آسودہ اند زیارت گاہ خلعت اند از اولاد سید محی الدین عبدالقادر
 جیلانیؒ است رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رحمۃ اللہ علیہم اجمعین و جدہ فقیر
 بنت خواجہ البی بن خواجہ بہاؤ الدین بن خواجہ عبداللہ المشہر بہ خواجہ
 خور و محقق ابن خواجہ باقی باللہ الحنفی المتخلص بہ بیرنگ قدس اللہ سرہ اہم است
 کہ در دہلی زیارت گاہ خلعت اند فقیر دوازده سال بود کہ والدہم بعالم
 بقا رحلت فرمودہ بودند و گاہ گاہ ایں خیال می آمد کہ از کسے دوست حق
 بہ پیوندم تعلیم راہ حق از و حاصل نمایم۔ چوں بہ عمر بہت و پنج سالگی
 رسیدم تحصیل علوم شغولی در زیدم و حنیکہ عمر بہت و نہہ سالگی رسید
 شبے در خواب دیدم کہ شخصے می گوید کہ ترا عم تو سید شاہ نظام الدینؒ احمد
 قادری رحمۃ اللہ می طلبند۔“

اس خواب کی تعبیر حضرت فتح علی شاہ گردیزی نے بیان کی اور فرمایا :
 ”کہ تعبیر ایں خواب یہیں است کہ ترا مبارکباد بہ روز جمعہ پیش ما آئی۔
 پس روز جمعہ حسب ارشاد رسیدم و از دولت بیعت و رفقہ فائز گشتم۔“
 میر فتح علی شاہ کی ہدایت کے مطابق غمگین پٹنے میں حضرت خواجہ ابوالبرکات کی خدمت

لے مکاشفات الاسرار نسخہ لندن۔ دیباچہ
 ۲۵ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ سندھیا مولفہ ابورنگنا تھ داس مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۰۷ء
 ص ۱۰۹

میں حاضر ہوئے اور انھوں نے چلتے وقت دو سلسلوں کی اجازت دی :
 "وقت رخصت مرا اجازت دو سلسلہ کے قادریہ و دیگر چشتیہ عطا فرمودند
 بعد ازاں فقیر در بلدہ گوالیار چند سال در صحبت آں بزرگواران فائدہ ہا
 ربود"

اس دیباچے سے حضرت عکیم کی ادبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے :
 "از زمان سابق دیوان ریختہ گفتہ بودم آں را دور کردم و الحال کہ عصر بہ
 شصت سالگی رسیدہ آنچہ کہ واردات ہرمن غالب بودند موافق آں ہا
 دیوان دیگر در حالات و ذوق و شوق حقیقی و مجازی خود
 ترتیب دادم و بعضے غزلیات مخصوصہ دیوان سابق دریں دیوان
 لاحق مندرج ساختم و چون دیوان نوبہ اتمام رسید و واردات و
 غلبات و کیفیات بردلم استیلا داشت۔ خواستم کہ برائے برادر دینی
 عزیز از جان اسد اللہ خاں میرزا نوشتہ تخلص بہ غالب واسد کہ دین
 زمانہ در نظم و نشر نظیر خود ندارند..... ترتیب دہم۔"

حضرت عکیم نے مکاشفات الاسرار کی شرح بھی لکھی ہے جس کا نام مراتب حقیقت
 ہے۔ اس کی "شان نزول" یہ ہے :

"یک روز در باغچہ نشستہ بودند کہ ہمارا جہ عالی جاہ بہادر (دولت
 راؤ سندھیا) برائے آں جناب (خواجہ ابوالحسن) تیار کنایہ شدہ بود،
 سخن (خواجہ ابوالحسن) فرمودند۔ کمال باریک۔ و از حاضران فرمودند کہ
 معنی این بیان کنید۔ ہر یک از یاراں موافق استعداد خود عرض نمود۔
 فقیر را ہم گفتند کہ تو ہم چیزے بگو۔ من ہم موافق استعداد خود عرض نمودم۔
 دیدم کہ بہ چہرہ مبارکش بشارتے پیدا آمدہ.... بعد پنج سال اسرار ہا در دل
 فقیر جوش آوردند کہ طاقت تحمل نہانہ ناچار یک دیوان ہفت "صد غزل" گفتم۔
 بائے قدرے تسکین حاصل شد۔ باز اسرار ہا در دل پیدا آمدن گرفتند۔"

باز یک دیوان رباعیات قریب ایک ہزار و ہشتاد و باقی نکتہ شد و چند روز خاموش ماند۔ بعد دوسہ سال بار اسرار ہاجوش آوردند و دوستان من نیز گفتند کہ (کسے) کتاب نہ باید گفت (؟) کہ اسرار و مسائل تصوف واضح شوند و بہ آسانی در فہم آیند و نام آں دوستان در دیباچہ نوشتہ ام۔ پس این کتاب نوشتہ شد۔ ایں ہمہ از برکت زبان مبارک آں جناب است والا من آنم کہ من دانم ^{۱۱۱}

حضرت غمگین نے ایک کتاب شغل و اشغال میں بھی لکھی ہے جو ارشاد الحیمنی کے نام سے مشہور ہے۔ اس لیے کہ حضرت سید فتح علی گردیزی کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا نام جواہر نفیسہ ہے۔ اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں :

”می گوید فقیر حقیر.... شرف اندوز پاوس مخدومی سیدی.... فتح علی حسینی الرضوی الکر دیزی ثم الشاد جہاں آبادی دام ظلہ.... شدم و بیعت نمود۔ شب و روز در خدمت شریف حاضری بودم و جاروب کشی آستانہ تبرکہ می کردم.... و در عرصہ اسی و یک سال آں چہ از زبان درفشان ارشاد می شد آں را در صد سینہ نگاہ می داشتم و می سپردم در خزینہ حافظہ اذکار و اشغال و مراقبہ و مشاہدہ و لطائف و مقامات و غیرہ...“

حضرت غمگین کے حالات ان کی تصانیف کے علاوہ دوسرے بزرگوں کی ملفوظات میں بھی ملتے ہیں۔ کیفیت العارفین میں لکھا ہے :

”چوں حضرت قطب العاشقین (حضرت ابوالبرکاتؒ) بہجوم خلایق بہ خود دیدند، در آں زماں اکثر طالبان راہ را بہت تربیت یافتن باطن تفویض خلف الرشید خود حضرت خواجہ ابوالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ می نمودند چنانچہ در آں روز ہا سید علی شاد از گویا رطال ب نعمت باطنیہ گشتہ بہ خدمت

۱۔ مرات حقیقت، خطی نسخہ ملکہ غمگین اکادمی گویا ر، ورق ۳۰۶
 ۲۔ جواہر نفیسہ (قلمی) دیباچہ غمگین اکادمی گویا ر۔ اس کتاب کا مادہ تاریخ ”غریب“ ہے جس سے ۱۲۱۷ھ تکلیفی ہے (۱۸۹۹ء)۔

حضرت قطب العاشقین آمدہ تربیت یافتہ، مشرف از خلافت از خواجہ ابوالحسن صاحب، گرویدہ مراجعت بہ سمت گوالیار کردند۔ آن جا بعد از دو سال حسب استدعای راجہ دولت راؤ سندھیامع اخراجات جہت رونق افروزی حضرت قطب العاشقین در شہر عظیم آباد آمدند و برائے تشریف بری آن حضرت تذکرہ آوردند۔ از آن جا کہ حضرت قطب العاشقین را رغبت حشمت و خدم در مزاج بیچ نہ بود۔ از آن جا صدائے نہ برخاست۔ الا خاف الرشید آن حضرت خواجہ ابوالحسن صاحب ایں امر را قبول نمودند.... و قتیکہ خواجہ ابوالحسن صاحب در گوالیار رسیدہ.... متعلقان را نیز از شہر عظیم آباد طلبیدند۔ بعد از دو سال حضرت قطب العاشقین نیز کہ خلف الرشید خود را از دیگر فرزندان عزیز تر داشتند، تاب مفارقت نہی آورده.... خود مع دیگر لواحقان عزم سفر سمت گوالیار برداشتند۔

یہ ماخذ سوانح غمگین کے سلسلے میں اہم ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان سے نہ تو تاریخ ولادت معلوم ہوتی ہے اور نہ تاریخ وفات۔ غمگین (کادمی میں) اکابر و خطیبے کی کتاب ہے اس میں حافظ میاں عبدالرزاق عزت میاں میر، علی التملص بہ رزاق کے قلم سے حضرت غمگین کی تاریخ ولادت یکم صفر ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء) اور تاریخ وفات ۳ صفر ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) لکھی ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو وہ سابقہ بیانات کی رو سے ۲۹ سال کی عمر یعنی ۱۱۹۶ھ/۱۷۷۲ء میں بیعت ہوئے اور ان کی کئی ادبی زندگی کا آغاز ۶۰ سال کی عمر یعنی ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں ہوا۔

غمگین کی وفات پر نواب مصطفیٰ خاں شیعہ نے ایک قطعہ تاریخ کہا ہے جس سے رزاق

لہ کیفیت العارفین و نسبت العاشقین مطبوعہ ۱۲۵۰ھ مورخہ سید شاہ عطاء حسین البٹہ عبدالرزاق
فانی عظیم آبادی المتوفی ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء مطبع گوالیار (بہار) ص ۲۰۶۔

کی تصدیق ہوتی ہے :

بہ عرف حضرت غمگین تخلص
شدہ سید علی نعمہ رانی
بہ صورت سالک راہ طریقت
بہ معنی شاہ ملک کام رانی
بدیدہ مجو دیدار خدا بود
بہ دل آگہ ز اسرار نہانی
بطویش دیدہ کحل البصیرت
طہورش سرمہ چشم معانی
دلش چوں یافت ذوق ربانی
خطاب آمد کہ تو در خود نمائی
بہ یک شبہ سوم روز صفر شد
کلیم آسا بہ زیر کوه فانی
زدل آہے کشیدہ شیفہ گفت
بہ برد اور اصدائے لن ترانی

۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء

غمگین کا ذکر بعض تذکروں میں بھی ہے۔ عمدہ منتخبہ (تذکرہ سرور) میں لکھا ہے :
”غمگین تخلص۔ میر سید علی خلف الرشید میر سید محمد مرحوم برادر زادہ حقائق و
معارف آگاہ سید شاہ نظام الدین احمد قادری، ناظم صوبہ دار الحکولہ۔
تشریح بزرگی و حب و نسب محتاج بہ تحریر نیست۔ مرد بامروت و قابل
است۔ از تصانیف دوست :

تو نے صیاد دنیا ظلم یہ ایجا د کیا بال و پر تو رقص سے مجھے آزاد کیا
ترے ثانی اگر کوئی بشر ہوے تو میں جانوں
بشر تو کیا اگر شمس و قمر ہوے تو میں جانوں
بہر میں اس کے دل جینے سے میرا میرے لے اہل بہر خدا آجلہ اب کیا دیر ہے
دل اس کو دیا اب کیا تدبیر سے ہوتا ہے
جو کام کہ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے
سوائے تیرے نہیں کوئی یا رانگوں میں پھر ہے تو ہی تو لیں ہنار انگوں میں

لے بشکریہ پیر زادہ ہاشمی میاں سید رضا محمد صاحب حضرت جی۔
عہ عمدہ منتخبہ (تذکرہ سرور) عکس نسخہ انڈیا آفس، ورق ۲۹۲

مہرباں کوئی مرا جز عشمِ دلدار نہیں
خس کا شعلے کے سوا کوئی خریدار نہیں

مڑگاں کہے ہے اس کا گرتیر ہے تو میں ہیں

اور دل کہے ہے میرا بچھیر ہے تو میں ہوں

عشق میں رو رو کے جو یہ داغ دل کھوتی ہے شمع

رشتہ الفت کو پروانے سے کیوں کھوتی ہے شمع

بلبل ہے اگر بہار سے خوش ہم اپنے میں گلِ غدار سے خوش

دل کے لگ جانے کا یاروں سے کہوں کیا باعث

ایک قصہ ہے جو ناحق میں کہوں کیا باعث

عاشق ہوا ہے میرا یہ دل اس کی آن پر

اللہ کیسی آن بنی مسیری جان پر

اس ابر میں مے پینا مستوں کو جواز آیا

ساتی مے آیا مطربِ مع ساز آیا

عیارِ اشعار میں خوب چند دکا نے لکھا ہے !

”میرؔ غلیٰ غلین.... جو ان گرم اختلاط و خوش خلق و شگفتہ بیان، سعادت

آئنا، ستودہ اطوار، پر حلم و حیا معلوم شد۔ بہ اصلاح سعادت یار خاں

زنگین کلمہ، اے اشعار آب دار خود را رنگ و بو سے تازہ بخشنده ہمسگی

دیوان معروف و اد نظر ایں فقیر انواع المعانی در آمدہ۔“

اس کے بعد نمونہ یہ سات شعر دیے ہیں :

مرا اس عشق کی دولت سے چہرہ ارغوانی ہے

نکلتا ہے جو اشک آنکھوں سے میرا، ارغوانی ہے

میرے صیدا دنیا ظلم یہ ایجا دکیا بال دپر تو دقفس سے مجھے آزاد کیا

دربار کوئی مزاجز غم دندار نہیں خسر کا شعلے کے سوا کوئی نثر یا نہیں

یہ داغ عشق نہ ہو دور اپنے سینے سے

کہیں شاہ کھدا حرف بھی نیگنے سے

گو سیہ بخت ہوں پر سرمہ بینائی ہوں جو کہ دیکھے ہے سوا نکھوں سے لگا تا ہے مجھے

مضطرب تھا دل اپنا جوں پارا

آخر اس شوخ نے حبا مارا

ایک مدت رہے ہم عشقِ بتاں میں غمگین

بعد ازاں کعبہ کو بھی کر کے سمنہ دیکھ لیا

سرور اور ذکا کے تذکروں میں جن اشعار کو منتخب کیا گیا ہے وہ موجودہ دیوانِ غمگین

میں نہیں ہیں۔ اس لیے قرینہ غالب ہے کہ یہ اشعار اس دیوانِ اول کے میں جو ۱۱۹ھ سے پہلے ترتیب دیا گیا تھا اور جو بیعت کے بعد غمگین نے خود ہی مسترد کر دیا تھا۔

غمگین کا ذکر مجموعہٴ نغز میں بھی ہے۔ اس کا یہ اقتباس دل چسپی سے خالی نہ ہوگا:

”غمگین تخلص.... جو انے نیک زندگی، کشادہ پیشانی، خوش اختلاط، مستحکم

ارتباط، یارِ اش، محبت، لاش، مجلس نواز، مخالف گداز، باعز و سکیں شاگرد

سعادت یا رخصانِ رنگین است۔ نلی قدر حال خطِ نسک (کذا) می نوید و کم کم

فکر سخن می گزید۔ خوش زندگی می کند و با فرح و سرور، ایام بے بدل جوانی

بکام دل بسر می برد۔ بہر حال اس چار بیت منسوب بدوست :

(۱) میرے صیاد نے کیا ظلم الخ

(۲) یہ داغ عشق نہ ہو دور الخ

(۳) میرا اس عشق کی دولت سے

(۴) گو سیہ بخت ہوں پر سرمہ بینائی ہوں

جو کہ دیکھے ہے سوا نکھوں سے لگا تا ہے مجھے

اس شعر سر ق طالبِ حکیم است۔ اما بہ زبان خود خوب گفتہ ہے

محاسن رنگین میں غمگین کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے غمگین کو اپنا شاگرد لکھا ہے اور اپنی وہ غزل دی ہے (مان کر۔ جان کر) جو انھوں نے جرات کی زمین میں غمگین کی فزائش پر پی البدیہ کہی تھی۔ دوسرے موقع پر غمگین کے اس شعر نقل کیے ہیں جو انھوں نے ڈھاکہ میں چند دوستوں کے سامنے اور ایک کشتی کی سواری کے دوران میں پڑھے تھے۔
 غمگین نے بھی رنگین کی اسادی کا اعتراف کیا ہے قطعہ تاریخ میں لکھا ہے :
 جب استاد رنگیں جہاں سے گئے تو ایک یادگاری رہی رنجی
 خرد نے کہا یہ ہی تاریخ ہے کہ ساتھ ان کے غمگین گئی رنجی

۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء

غمگین کا ترجمہ کریم الدین، نساخ، شیفٹہ اور عبدالحی صفٹا نے بھی دیا ہے لیکن کوئی نئی یا خاص بات نہیں لکھی۔ سید فتح علی گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویاں میں اٹھانوے شعرا کا ذکر ہے لیکن غمگین کا ذکر نہیں ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے مؤرخ الذکر کا شمار استادوں میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ نواب الہی بخش خاں معروف نے بھی غمگین سے مشورہ سخن کیا تھا۔

۱۔ محاسن رنگین : نظامی پریس لکھنؤ ص ۱۰

۲۔ محاسن رنگین ص ۶۲

۳۔ معزن الاسرار قلمی : غمگین اکادمی گوالیار

۴۔ تذکرہ کریم الدین : ص ۱۹۰ و ۱۹۱ (طبعہ دوم) طبع دہلی۔ ۱۸۳۸ء

۵۔ نساخ : سخن شعرا، ص ۳۵۳، مطبع نول کشور

۶۔ شیفٹہ : گلشن بے خار، ص ۱۳۳، مطبع نول کشور

۷۔ صفٹا : شمیم سخن، ص ۱۰۰، مطبع امداد الہند، مراد آباد

۸۔ تذکرہ ریختہ گویاں، مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق، مطبوعہ اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء

۹۔ مقدمہ دیوان ذوق، محمد حسین آزاد،

غالب کا سکّہ شعر

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مرزا غالب پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ ”باغیوں“ سے اخلاص رکھتے تھے اور انھوں نے بہادر شاہ کی شہنشاہی کے اعلان پر جو امر میٰ ۱۸۵۷ء کو ہوا، ایک سکّہ شعر بھی کہا تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے تفصیل سے ایک خط میں کیا ہے جو حسین مرزا کے نام ہے اور ۱۸ جون ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے:

”اب میرا دکھ سنو، بھاگا نہیں، بکرا نہیں گیا، دفتر قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں، کسی طرح کی بے وفائی و نمک حرائی کا دھبہ مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شکریا گوری دیاں یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا، اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکّہ کہہ کر گزرا نا۔“

بہ زرد سکّہ کشورستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی
مجھے: الملاقات صاحب کشتی نے پوچھا کہ یہ کیا لکھا ہے۔ میں نے کہا کہ غلط لکھا ہے۔ بادشاہ شاعر بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر،

خدا جانے کس نے کہا۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا تو دفتر سے وہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا اور آپ چاہیے حکیم حسن الشرفان سے پوچھیے۔ اس وقت تو چپ ہو رہا۔ اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی رو بکاردی لکھوا لیا کہ یہ جو اسد اللہ خاں فارسی کے علم میں یکجا مشہور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکہ لکھا، ہمارے نزدیک ان پشن لے پانے کا مستحق نہیں ہے....

یوسف مرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی یہاں منشی میراج حسین ولد روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا۔ وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا، ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ کوہی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ چھپانی تھی، وہاں اس سکہ کا گزرنا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا۔ اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۲۸۳ء یا ۱۲۸۴ء میں واقع ہوا ہے بعض صاحب اخبار جمع کر رکھتے ہیں، اگر وہاں کہیں اس کا پتا پاؤ گے اور وہ اخبار اصل بجنہ مجھ کو بھیجاؤ گے تو بڑا کام کر دوں گے یہ

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) جو سکہ غالب سے منسوب کیا گیا وہ یہ ہے ۵

بہ زرد سکہ کشورستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

(۲) غالب اس کی تصنیف کے منکر ہیں اور اسے ذوق کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

(۳) غالب کے خیال میں یہ سکہ بہادر شاہ کی تخت نشینی کے وقت ۱۲۸۴ء یا ۱۲۸۵ء

میں کہا گیا تھا۔ یہ مرشد آباد تک مشہور تھا اور دہلی اردو اخبار میں چھپ چکا تھا۔

اسی لیے غالب کو اس اخبار کی تلاش تھی جو دھری عبدالغفور سرور کو ایک خط

میں لکھتے ہیں :

۱۹۳۸-۳۹ء

”جناب چودھری صاحب آج کا میرا خط کاٹ لے گا، یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں، تفصیل یہ کہ مولوی باقر دہلوی کے مطبع میں سے ایک اخبار ہرمینے میں چار بار نکلا کرتا ہے، سہمی بہ دہلی اردو اخبار۔ بعض اشخاص سنین ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیانا آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھ جائیں جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دوست کے نام کے کہہ کر بذر کرنے کا ذکر مندرج ہو بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل مجنسہ میرے پاس بھیج دیجئے۔“

چودھری عبدالغفور اس پرچے کے حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ ان کو لکھتے ہیں:

”آپ کی سعی اور اپنی ناکامی پہلے سے میرے دلنشین اور خاطر نشاں ہے جیسا کہ کوئی استاد کہتا ہے۔“

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کمال کہ خضر از آپ حیواں تشہمی آرد سکندر را وہ اخبار نہ کہیں سے ہاتھ آیا اور نہ آئے گا۔ میں اپنے خدا سے امیدوار ہوں کہ میرا کام بنیر اس کے نکل جائے گا۔“

اگلے خط میں پھر اسی کا ذکر ہے اور اس کا افسوس ہے کہ یہ الزام کسی طرح دور نہ ہو سکا:

”سکے کا دار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب، کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں، یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دوست کہہ کر گزرا نہ۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے، انھوں نے دلی آرد و اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس کے علاوہ اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔“

اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرائے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلم و ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ وجہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافقِ رضا الہی ہے، اس کا گلہ کیا ہے چوں جنبشِ سپہر بہ فرمانِ داور است بیدار نہ بود آغچہ بہا آسماں و ہدٰی“

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

”وہ دہلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے، ورنہ خیر، کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حکامِ صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہِ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ، گو لہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بینک گھر اور میگزین کا ٹوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں“

سوال یہ ہے کہ غالب کے وہ ”دو مصرعے“ کون سے تھے؟ تھے بھی یا نہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ جو سکہ غالب کے نام سے مشہور ہوئے وہ درحقیقت ان کے نہیں تھے اور اس معاملے میں ان کا اضطراب بجا تھا۔ لیکن انھوں نے سکہ بھی کہا تھا اور قصیدہ بھی گزرائے تھا، اس طرح ”باغیوں“ سے اخلاص کی بات بالکل نظر انداز کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اس کے اعادے میں بھی مضائقہ نہیں کہ جو سکہ میں نے دریافت کیا ہے وہ غالب کے انکار کی بنیاد نہیں ہے اور نہ وہ ان کے کسی خط میں معرضِ بحث میں آیا ہے۔

معین الدین جن خاں نے خدنگِ غدر میں لکھا ہے کہ لکھنؤ سے مرزا عباس نذر

۱۔ اردو سے ملے، مطبوعہ ۱۸۹۹ء، ص ۱۰۳، ۱۰۴

۲۔ خطوط غالب مرتبہ مولوی ہمیش پرشاد، ص ۱۵۶

۳۔ عکس ملو کہ راقم۔ یہ کتاب شعبہٴ اردو، دہلی یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے

لائے، جس میں بادشاہ کے نام کی اشرفیاں تھیں اور جن پر یہ شعر کھدا ہوا تھا:
 بہ زرد سکہ نصرت طرازی سراج الدین بہادر شاہ غازی
 یہاں ایک جملہ معترضہ ضروری ہے، مشکاف نے خدنگ غدر کے انگریزی
 ترجمے میں سورج الدین لکھا ہے، اس کے علاوہ اس میں ترجمے کی بے شمار غلطیاں ہیں
 خواجہ حسن نظامی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کروایا ہے اور اصل متن نہیں دیکھا۔
 مشکاف کا ترجمہ غلط اور خواجہ حسن نظامی مرحوم کا غلط در غلط ہے۔

ممکن ہے یہ سکہ (بہ زرد سکہ کشورستانی : سراج الدین بہادر شاہ ثانی)
 بہادر شاہ کی تخت نشینی (۱۸۵۷ء) کے وقت کا ہو اور بعد میں "کشورستانی" کے
 بجائے نصرت طرازی اور "ثانی" کے بجائے غازی کے الفاظ سنہ ستاون کی
 جہد آزادی کے پیش نظر بدل دیے گئے ہوں۔ اس میں اور غالب کے نقل کردہ سکہ
 میں اصل فرق یہی ہے، اس کا مصنف کون ہے؟ یہ کہنا مشکل ہے، لیکن جیون لال
 معین الدین جن خاں دونوں نے اسے ایک ہی طرح لکھا ہے اور کسی نے اسے غالب
 سے منسوب نہیں کیا، پوری خدنگ غدر میں صرف ایک جگہ غالب کا ذکر ہے، وہ
 بھی ان کے بھائی کے ذیل میں ہنگامہ جرنیلی کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

"محلہ کھڑکی فراش خانہ میں مولوی فرید الدین صبح کی نماز پڑھتے ہوئے مسجد
 میں مارے گئے، حکیم ضی الدین خاں و حکیم احمد حسین خاں بھی اسی طرح مع اپنے
 قاتلوں کے ملک عدم کو دست و گریبان روانہ ہوئے، مرزا یوسف برادر خورد
 اسد اللہ خاں غالب کہ قدیم سے مجنون تھے، حالت جنون میں گھر سے باہر
 نکل کے ٹہلنے لگے، وہ بھی مارے گئے اور کئی آدمی آبر (و) دار، نامی اس
 ہنگامہ جرنیلی میں معرض قتل میں آگئے۔"

۱۷ TWO NATIVE NARRATIVES OF THE MUTINY IN DELHI
 TRANSLATED BY C.T. METCALFE, 1898, PAGE 69.

۱۸ غدر کی صبح دشنام، مطبوعہ سہمد و پریس دہلی (۱۹۲۶ء) مرتبہ مولوی ضیاء الدین برنی
 ۱۹ خدنگ غدر مخطوطہ بقلم مصنف، ورق ۱۴، الف۔ عکس ملوکہ راقم۔

مشکاف نے جیون لال کے روزنامے کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بھی بہت سی فاحش غلطیاں ہیں۔ اس ترجمے میں غالب کا سکہ نذر ہے لیکن اصل روزنامے میں موجود ہے۔

منشی جیون لال کے الفاظ یہ ہیں :

”انیسویں مئی ۱۸۵۷ء“

دربار شاہی منعقد ہوا۔ مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہو کر ایک سکہ جلوس دربارت تخت نشینی حضور گزرا نا۔ سکہ شعر :

سکہ زوہریم وزر در بند شاہ دیں پناہ ظلِ سبحانی سراج الدین بہادر شاہ (کذا)
اس پر اور شاعروں نے بھی سکے کہے۔ سکہ شعر :

سکہ صاحب قرانی زوہر بتائید الہ سایہ یزداں سراج الدین بہادر شاہ (کذا)
(ورق ۳۸ ب) دیگر سکہ شعر :

سکہ صاحب قرانی زوہر بتائید الہ ظلِ سبحانی سراج الدین بہادر شاہ
دیگر سکہ شعر :

بز زوہر سکہ نصرت طرازی سراج الدین بہادر شاہ غازی
دیگر سکہ شعر۔ مرزا نوشہ :

بز زوہر آفتاب و نعتہ ماہ سکہ زوہر جہاں بہادر شاہ

مشکاف نے اس عبارت کا ترجمہ کہ ”مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہو کر ایک سکہ جلوس دربارت تخت نشینی حضور گزرا نا۔ الخ“ اس طرح کیا ہے۔ اصل کے ساتھ بقول اٹالیوں کے غدار ہے۔

لے جیون لال : روزنامہ اردو قلمی عکس ملوکہ راقم۔ ۲۷ روزنامہ منشی جیون لال اصل مسودہ ملوکہ مشکاف ورق ۳۸
الغوب عکس ملوکہ راقم۔ ۳۷ مشکاف نے یہ ظہور علی کی ریٹھ لگائی ہے۔ ”سکہ جلوس“ اور ”دیگر سکہ شعر“ کا ترجمہ
مفکد خیر ہے۔ اس سے لہذا مفہوم بدل گیا ہے (مشکاف کا ترجمہ ص ۹۶) خواجہ جن نظامی نے لکھا۔ ”مولوی علی تھانہ دار
بھی حاضر تھے اور انھوں نے نذر کے طور پر چند اشرفیاں پیش کیں۔ سکوں پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ سکہ زوہریم وزر الخ۔
دوسری جانب حسب ذیل عبارت درج تھی : سکہ صاحب قرانی الخ“ ملاحظہ ہو غدر کی صبح و شام ص ۱۱۳۔

MOLVI JAJJAR ALI (۲) THANADAR ATTENDED AND PRE-
SENTED A SICCA OF GOLD MOHUR AS TRIBUTE MONEY. ON THE
COINS WERE INSCRIBED ON THE REVERSE:

سکہ زد بر سیم و زر الخ

سکہ صاحبقرانی زد الخ

منشی جیون لال کی روش غالب کے ساتھ معاندانہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ شعر ہے

برزد آفتاب و نعتہ ماہ سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

خود پکار پکار کر رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اب تک مختلف شاعروں کے ساتھ سکے سامنے آئے ہیں لیکن اس "قدردل کش" کے ساتھ کوئی بھی نہیں آیا۔

غالب نے ایک قصیدہ بھی اس زمانے میں فتح آگرہ کی خوشی کے موقع پر پیش کیا

تھا، آگرے کے اخبار عالم تاب میں لکھا ہے کہ "مرزا نوشہ اور محرم علی خاں نے ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے تھے" اس کی کپی تائید

منشی جیون لال کے روزنامے سے ہوتی ہے۔ ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے ذیل میں لکھا ہے:

(فتح آگرہ کے مزدے سے سب بادشاہ و اہل قلعہ خوش تھے) "مرزا نوشہ اور

محرم علی خاں نے ایک قصیدہ من تصنیف خود بادشاہ کی مدح میں پڑھے۔"

غالب کے ایک شاگرد — مولانا بیدل

مراد ہے مولانا عبد السمیع بیدل سے۔ تلامذہ غالب میں ان کا سرسری ذکر ہے۔ اس ترجمہ میں نہ تو ان کی پوری تصانیف کا احاطہ کیا گیا ہے اور نہ ان کی کوئی غزل درج کی گئی ہے بلکہ حالات کہ غالب سے ان کے معنوی تعلق کا اصلی سرچشمہ یہی ہے۔ تلامذہ غالب کی یہ بات بھی قرین صحت نہیں کہ بیدل کی ”نور ایمان“ میں ”مسائل دینی“ نظم کیے گئے ہیں (یہ دراصل نعت شریف میں ایک رسالہ ہے جس کا دیباچہ نثر میں اور اصل رسالہ نظم میں ہے) یہ اطلاع بھی صحیح نہیں کہ نور ایمان کے دیباچے میں عبد السمیع بیدل کے یہ اشعار ”دوستو بے دار فانی چند روز الوداع“ درج کیے گئے ہیں۔ ہمارے سامنے نور ایمان کا وہ نسخہ ہے جو شرف المطالع میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں یہ اشعار کہیں بھی موجود نہیں۔ اور دیباچہ تو از اول تا آخر نثر میں ہے۔ اس میں ایک مصرع بھی نہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن بھی ترمیم کے ساتھ شائع نہیں ہوا۔ ان وجوہ سے مگان

تلامذہ غالب (مالک رام) ص ۵۲ ۲۱۲ ایضاً ۲۱۲ ایضاً

۲۱۲ نور ایمان مطبوعہ شرف المطالع، میرٹھ ۱۳۱۲ھ (۱۹۹۴ء)

ہوتا ہے کہ صاحب تلامذہ غالب نے نورایمان کو ملاحظہ نہیں فرمایا، کسی اور ذیل سے معلومات اخذ کی ہیں، ورنہ وہ اس کے مندرجات سے ہمیں صحیح طور پر مطلع فرماتے اور اس کے صفحہ، مطبع اور ایڈیشن کسی چیز کا تو حوالہ دیتے۔ اس کے علاوہ مولف موصوف، عبد السمیع بیدل کی کلام دو کتابوں کو "موجود" بتاتے ہیں، حالانکہ اس وقت ان کی دس تصانیف ہمارے سامنے موجود ہیں جو محب مکرم بھیا شمس الدین صاحب رئیس میرٹھ کی مہربانی سے حاصل ہوئی ہیں۔ موخر الذکر محمدی خان بہادر شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم و مغفور کے چھوٹے صاحبزادے ہیں اور خان بہادر صاحب، بیدل کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ گویا شاگردی کے لحاظ سے غالب کے پوتے تھے۔

نورایمان کا دیباچہ اس طرح شروع ہوتا ہے :

"عبد اسمیع بیدل اور اللہ رسول کی صفات! وہی مثل ہے چھوٹا منہ بڑی بات۔ اس زبان کثیف کو اُس نام لطیف سے کیا مناسبت۔ خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت۔ بھلا جس کا بال بال خطاؤں میں بھرا ہوا ہو۔ اس سے یہ پاک عمل سراسر صواب کیونکر ادا ہوا۔ لیکن کیا کیجیے بدین نہیں پڑتا کہ یہ نام نہ لیجیے کبھی دل اور زبان کو اس نام سے تھل دیا جاتا ہے کہ لا الہ الا اللہ اور کبھی روح رواں کو اس نام سے تازہ کیا جاتا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہِ ہر پھر کر ہی دو نام۔ ان ہی دو کی اطاعت سے اہل ایمان کا حسن انجام ملتا ہے۔"

مولانا بیدلؒ (۱۲۵۳ھ) میں شہر "جاں آسائے" راحت افزائے دہلی میں پہنچے اور علوم معقول و منقول مفتی صدر الدین آزرودہ اور دیگر اکابر علمائے دین سے حاصل کیے۔ خود لکھتے ہیں :

"اُن آیام میں بہ افتخار عفتوان شباب دل میں یہ بھی ایک موج آنی کہ جناب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ دہلوی سے شعریں اصلاح یعنی ٹھہرائی۔ تب البتہ عاشقی و معشوقی کے مضامین مہذبہ رسمہ بنا، زماں کی طرز پر لکھتا

تھا لیکن ان مضامین پر دل دادہ و فریفتہ نہ تھا۔ اسی وجہ سے ان کو بحفاظت تمام لکھ لکھ کر محفوظ رکھتا نہ تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے ان وقتوں کی لکھی ہوئی ایسی منتشر گزشتیں کہ ان کا کہیں پتا نہیں مگر ایک قدر دان سخن نے امرا خان بہادر شیخ بشیر الدین مرحوم (ان میں سے کچھ اشعار بمشقت فراہم کیے ہیں)۔

مولانا عبد السمیع بیدل کا یہ مجموعہ طراز سخن کے نام سے ۱۸۹۶ء میں محمود پریس محلہ اندر کوٹ میرٹھ سے شائع ہوا جو "غزلیات و عیدیات و دیگر منظومات" پر مشتمل ہے اور جس کے شروع میں مذکورہ صدر "صاحب زادہ بشیر الدین احمد صاحب خلیف خان بہادر حاجی عبد الکریم صاحب سی۔ آئی۔ ایم میرٹھ" کا دیباچہ بھی شامل ہے۔
مولانا عبد السمیع بیدل "رام پور ضلع سہارن پور" کے رہنے والے تھے اور ان کا سلسلہ نسب "حضرت ابی ایوب خزر رجبی انصاری صحابی رضی اللہ عنہ پر منتہی ہو کر نصر بن کنانہ سے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں ہیں، جا ملتا ہے۔"

شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ بیدل نے ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں مرزا غالب سے تلمذ حاصل کیا لیکن "مشاغل باطنی" میں اتنا انہماک تھا کہ کچھ عرصے کے بعد عاشقانہ مضامین کے بجائے "نعت گوئی کی جانب توجہ فرمائی"۔ چنانچہ آپ کی مصنفہ کتابیں مثل نور ایمان و تسلیل و راحت القلوب و بہار جنت و منظر الحق وغیرہ مشہور آفاق ہیں۔

دیباچہ نگار و صوف نے لکھا ہے کہ :

"حضرت اتادی کی توجہ ان جو اہم زیاب (عاشقانہ کلام) کے مجتمع کرنے کی جانب مائل نہ تھی۔ بڑی دقت کے ساتھ میں نے جہاں سے جس قدر مل سکا، فراہم کیا اور جزیجاں بنا کر رکھا گیا۔ دہلی کی غریبوں کا مجموعہ بالکل نہ مل سکا اور ایام ندر دہلی کے بعد جو غزلیں لکھی

لے نور ایمان، ص ۳۔ طراز سخن، محمد پریس میرٹھ، ص ۲ تا ۴۔ طراز سخن، ص ۲۔ طراز سخن، ص ۳۔
۵ طراز سخن، ص ۳۔ بھتی شمس الدین کا بیان ہے کہ نعت گوئی کی طرف توجہ حضرت امداد اللہ بہادر کی قدس سرہ سے زیارت کے بعد ہوئی۔

گئیں، وہ بیاض چوری گئی۔

خان بہادر شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم نے جو کلام جمع کیا ہے وہ حضرت بیدل کی زندگی میں۔ اور اس مجموعے کے تیار کرنے میں ان لوگوں سے خاص طور پر مدد ملی ہے جن کو ان کا کلام یاد تھا۔ جو غریبیں ناتمام ہیں ان کو اسی طرح رہنے دیا ہے۔

طراز سخن ۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیباچے میں اس کا اعتراف ہے کہ اگرچہ موجودہ اردو شاعری "جدید تعلیم یافتہ طبائع" کے لیے "لطف انگیز" ہے لیکن بیدل کا کلام "عاشقانہ مضامین اور صنائع بدائع" دونوں اعتبار سے "سرا نکھوں پر جگہ دینے کے" لائق ہے۔

دیوان کی پہلی غزل کا مطلع ہے۔

بنایا عشق نے دل آئینہ اسرار جاناں کا

مراحل پریشان عکس ہے زلف پریشان کا

ذیل میں بیدل کے منتخب اشعار "طراز سخن" سے دیے جاتے ہیں:

آسمان راہ پر نہیں آتا	باز یہ فتنہ گر نہیں آتا
کوئی حسرت نہیں نکلتی ہائے	مدعا کوئی بر نہیں آتا
ہم بھی پتھر کا دل بنالیں گے	گر وہ سنگیں جگر نہیں آتا

موتی بھر لائی ہے یہ چاندی کی کشتی میں بہار

یا چنبیلی پر پردی ہے اوس دانہ دانہ رات

اس کے رخ سے صبح کا دھبکا نہ کھا مرغ سحر

دیکھ زلفوں کو ابھی باقی ہے اے دیوانہ رات

کٹ کے سراپنا گرا تو پائے قابل پر گرا

تھا شہادت کے لیے یہ سجدہ شکرانہ رات

رات بیدل نے غزل اک اور بھی لکھی ہے گرم
شمع تھی بے تاب جس پر صورت پروانہ رات

غم نہیں ہے کہ اضطراب نہیں
دل دیا حق نے وہ کہ بے بیتاب
یہاں تو یہ نوبت کہ سانس گنتے ہیں
اپنے عاشق کی بے کلی مت پوچھ
شعلہ روتیری گرم خوئی سے
جان پر میری کیا عذاب نہیں
آنکھ وہ دی کہ جس کو خواب نہیں
وہاں وہ غفلت کہ کچھ حساب نہیں
دن کو آرام، شب کو خواب نہیں
کون سا دل ہے جو کباب نہیں
مختصر ہے یہ حال بیدل کا
تن میں طاف، جگر میں تاب نہیں

جب اس بت کی ترچھی نظر دیکھتے ہیں
وہ آویں نہ آویں، مگر منتیں ہم
وہ دیکھتے، نہ دیکھے مگر ہم تو بیدل
زمانہ کو زیر و زبر دیکھتے ہیں
جو اپنی سی ہوتی ہیں کر دیکھتے ہیں
اسی کو بس آٹھوں پہر دیکھتے ہیں

بیدل میں کبھی کوچہ دلبر میں نہ جاتا
لایا مجھے میرا دل بے تاب ادھر کو

گر مانگ لیا مانگ نے دل اور جگر کو
وہ آئے، یہ آئے، ابھی غائب ہیں نظر سے
کچھ شوق نہیں شعر و غزل سے مجھے بیدل
چوٹی نے لیا گوندہ مرے تارِ نظر کو
ظالم تری شوخی نے کیا ماتِ شر کو
لے آتی ہے فرمایشِ احباب ادھر کو

دل چاک چاک ہو گیا تیغ ادا کے ساتھ
گر وصل بھی ہوا نہ ہوئیں بے حجابیاں
ٹکڑے جگر کے اور گئے، مشقِ جفا کے ساتھ
وہ جیلہ گرا دلچسپا بندِ قبا کے ساتھ

جب باغ باغ ہو کے وہ ہنسا ہے گلبدن جھڑتے ہیں پھول خندہ دنداں نما کے ساتھ
 گزرا نہ میرے قتل سے سب سر پٹک مرے منت کے ساتھ، عجز کے ساتھ، التجا کے ساتھ
 آجائے تو، تو جان پھر آجائے جسم میں مرکز بھی جی اونٹوں تیری آوازِ پا کے ساتھ
 دل کی بحث تلاش ہے پہلو میں دل کہاں
 بیدل تمہارا دل تو گب ادل رُبا کے ساتھ

اوتھاتے ہیں وہ رخ سے یوں نقاب آہستہ آہستہ
 چُٹنے جیسے گہن سے مابتاب آہستہ آہستہ
 نہیں کچھ ایک دوساگر کہ خم کے خم اولٹ دیں گے
 پلائے جاہیں ساتی شراب آہستہ آہستہ
 طراز سخن میں کچھ عیدیاں، پہیلیاں، قطعات تاریخ اور اشعارِ اسی بھی
 شامل ہیں۔

بیدل کی تصانیف جو ہمیں دستیاب ہو سکیں، ان کی تفصیل یہ ہے :
 ۱۔ نورِ ایمان - نعت شریف اور استحسانِ محفل میلاد میں - دیباچہ نثر میں ہے، باقی
 منظوم - مطبوعہ شرف المطابع میرٹھ - ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) تعداد صفحات ۷۲۔
 ۲۔ طرازِ سخن - (دیوان) محمود پریس میرٹھ - ۱۸۹۶ء - تعداد صفحات ۴۸۔
 ۳۔ ساسبیل فی مولدِ ہادی السبیل - قصیدہ نعتیہ - شرف المطابع میرٹھ۔
 ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) تعداد صفحات ۸

نمونہ :

اول میں وہ ہی ایک تھا، مولیٰ و والی ایک تھا
 وہ ذی تجلی ایک تھا، وہ ستر معنی ایک تھا
 وہ گنج ہستی ایک تھا، وہ کنزِ مخفی ایک تھا
 پیدا نہ کوئی ایک تھا، جز ذاتِ رب ذوالمنن

کب تھی یہ بچوؤں کی ہلک کب تھی یہ کلیوں کی چٹک
نسرین میں کب تھی یہ چمک، چمپا میں کب تھی یہ جھلک
لالہ میں کب تھی یہ دمک، کانٹے سے تھے گل برگ تک

معدوم تھے سب یک بیک، گل تھا نہ گلبن نے چمن
یہ قصیدہ بڑے والہانہ ذوق و شوق سے لکھا ہے اور اس میں قادر الکلامی کا پورا ثبوت
بہم پہنچا ہے۔

۴۔ مثنوی نعتیہ جوہر لطیف فی میلاد الحنیف - مطبع قاسمی میرٹھ ۱۳۲۷ھ - تعداد صفحات ۱۲۔
۵۔ حمل باری - بیان لغات میں منظوم رسالہ - مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۳۱۳ھ - تعداد
صفحات ۳۲ - ابتدا :

سیل ہے رو اور نالا اسے دبیر

ندی ارغاب اور تالاب آب گیر

۶۔ مظہر الحق - ارکان اسلام کے بیان میں منظوم رسالہ - تعداد صفحات ۲۲
اور تعداد اشعار ۲۹۰ - مطبع نامعلوم۔

۷۔ بہارِ جنت - (میلاد شریف) نثر اور نظم دونوں میں - مطبع محمدی کانپور ۱۳۱۰ھ -
تعداد صفحات ۷۲۔

۸۔ راحة القلوب (نثر) - ذکرِ رسول اور فضائلِ محفلِ میلاد میں - مطبع مجتہائی دہلی
۱۳۱۰ھ - تعداد صفحات ۹۲۔

۹۔ دافع الاہام فی محفل خیر الانام - مولود شریف کے جواز اور مولانا اسماعیل شہید
کی تردید میں ۳۸ صفحے کا رسالہ جو نثر اور نظم میں ملا کر لکھا گیا ہے - زیادہ تر دلائل
شاد ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانی ہی سے دیے گئے ہیں -
مطبوعہ مطبع چشمہ فیض ۱۲۹۶ھ

۱۰۔ انوارِ ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ - ”دہابی“ علما کے اعتراضات کا رد، سوال و
جواب کی شکل میں - مطبوعہ مطبع دارالعلوم میرٹھ ۱۳۰۲ھ - تعداد صفحات ۲۲۰۔

عبد اسمع بیدل شیخ الہی بخش رئیس میرٹھ کے یہاں بہ حیثیت معلم بارہ روپے ماہوار اور کھانے پر ملازم تھے۔ وہیں ۱۹۰۱ء میں انتقال فرمایا اور قبرستان موسوم شاہ ولایت میں دفن ہوئے۔ ان کے ایک صاحب زادے حکیم میاں محمد مرحوم، حکیم عبد المجید خاں دہلوی کے شاگرد اور میرٹھ کے مشہور طبیب تھے۔ معاصرین بیدل میں بیان یزدانی اور شوکت میٹھی معروف ہیں۔ امیر مینائی سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ بھتیجا شمس الدین کا بیان ہے کہ امیر کے خطوط بیدل کے نام جمع کیے گئے تھے جو سید اتفاق سے ضائع ہو گئے۔

معرکہ غالب و حامیانِ قتل

ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں

علاؤ الدین خلجی کا زمانہ تاریخ ہند کا ایک درخشاں باب ہے۔ منگولوں کی سفاکی و بے رحمی اور خلجیوں کی قدردانی اور علم برداری کی وجہ سے ہندوستان علم و فضل کا مرکز بن گیا تھا اور ایشیا کی منفرد مہنیاں یہیں اکڑ جمع ہو گئی تھیں۔ ملا عبد القادر بدایونی نے علاؤ الدین خلجی کے دربار کے فقرا، علما، فضلا اور شعرا کی طویل فہرست دی ہے۔ شبلی نے ان میں سے صرف ۶۰ اکابر کا ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے :

”لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا تھا

.... اس وسیع مرقع میں صرف امیر مہسوت کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔“

ادبیات میں ملکی اور غیر ملکی سوال کی ابتدا اور ایرانی ہندی نزاع کا آغاز بھی تقریباً اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ خسرو کی جامعیت اور اس کی شاعری اور زبانِ انی کا اعتراف تقریباً تمام ناقدین نے کیا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے :

”در حق اور مرتبہ سخن گزاری ختم تمام است۔“

خسر و کو تمام اکابر نے ”طوطی ہند“ مانا ہے :

عرفیؒ بہ روح خسرو ازیں پاریسی شکر دارم

کہ کام طوطی ہند و ستاں شود شیریں

”ماہم بعض شعرا قومی تعصب کو نہیں چھپا سکے۔ عبید جو خسرو کا معاصر ہے لکھتا ہے :

غلط افتاد خسرو راز خامی

کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

اس تعصب کی ایک وجہ یہ ہے کہ امیر خسرو نے بعض محاورے ایسے باندھے

ہیں جو اہل زبان کے یہاں نہیں ملتے۔ بعد میں یہ سلسلہ ”استعمال ہند“ بہت بڑا نزاعی سوال بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کبھی بھی مقامی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ متاخرین میں خان آرزو نے بھی اس استعمال ہند کو جائز سمجھا۔

فیضی اور عرفیؒ کے اختلافات اور نوک جھونک کی بھی ایک وجہ یہی ایرانی

ہندی نزاع تھی۔ خانی خان نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ فیضی کو کتوں کا بڑا شوق تھا۔

سگ بچوں کے سونے کے پٹے پڑے ہوئے تھے۔ عرفیؒ نے فیضی سے پوچھا :

”مخدوم زاد ما بہ چہ اسم موسوم اند“

فیضی نے کہا : ”بہ اسم عرفیؒ“

عرفیؒ نے برخستہ کہا : ”مبارک باشد“

ابو الفضل بھی عرفیؒ سے جلتا تھا۔ اکبر نامے میں لکھا ہے :

”درے از سخن سرائی برو کشودہ بودند۔ درخور نہ گریست و بر پاشانیاں

زبان طعن کشود۔ غنیمہ استعداد و شگفتہ پڑ مرد“

اکبر کے زمانے سے شاہد ہی کوئی ایرانی شاعر ایسا ہو جس کا کلام اعتراضات کا

لے تذکرۃ الشعرا (لاہور) ص ۱۵۸۔

لے لیکن فیضی نے اپنے مکاتیب میں عرفیؒ کی بڑی تعریف کی ہے۔

ہدف نہ بنا ہو۔ عرفی، ظہوری، قدسی، زلالی سب ہی اس تیغ ہندی کے زخم خوردہ ہیں یہی حال ایرانیوں کا تھا۔ حیدری تبریزی اکبر کا معاصر ہے اور اس نے ہندوستان کی داد و دہش سے بڑا فیض اٹھایا تھا لیکن جب وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں لکھتا ہے تو اس انداز سے :

در کشور ہند شادی و غم معلوم آں جادل شاد و جان خرم معلوم
جائے کہ بیک روپیہ آدم نہ خزند آدم معلوم و قدر آدم معلوم
والہ ہروی لکھتا ہے :

در ہند کہ زاد گانش تبارک ادب اند
بربریز جہالت اند و فاضل لقب اند

حزین کا بھی یہی خیال ہے کہ ہندوستان فضل و کمال کے لیے زمین شور کا حکم رکھتا ہے اُسے تمام دار الخلافہ میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو برفیضیت لکھتا ہو۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ یہ نزاع صرف چند الفاظ کے استعمال کی نہیں تھی بلکہ اس ضمن میں اسالیب و افکار بھی معرض بحث میں آگئے تھے۔ عہد حاضر کے ایک ایرانی محقق نے اس ہندی اسکول کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے :

” افکار و احساسات ابائی اس سرزمین بہ تاثیر عوالم سیاسی و طبیعی بر سر در عوام
توہم و تخیل و مجسم انگاشتن معانی باریک و لطیف کہ از عالم مادہ و جسم
دور می باشد متماثل است و در اداسے این تخیلات و توہمات و سائل مزبورہ
کہ بہ منزله اصل و ناچیز اوست از فروع آں می باشد تشبیہ مقولات است
بمحوسات و بالعکس دے رعایت تناسب تام بین مشبہ و مشبہ بہ و بیان این
قبیل تشبیہات است بہ طریق استعارہ کہ نوع از مبالغہ در تشبیہ می باشد
نتیجہ این سبک بیان پیدایش معانی و مضامینے است بسیار غریب و دور
از ذہن کسانے کہ بہ افکار ہندی آشنا نیستند و بہترین نامے کہ بہ دیں ملز بیان

لے سبک بمعنی روش خاص۔

می تو اس داد "خیال بندی" است کہ منتخب و مستعل خود ہندی ہا است۔
 نمونہ "خیال بندی" این است کہ از مرثہ دل دار یک مشت سوزن بہ سازند و
 آن را در خیاط خانہ دل بہ ریزند و خیاط گریہ را بہ گویند تا از تکہ ہا و پارہاے
 دل براے چشم پیراہن بہ دوزند و آن گاہ این معنی را در قالب الفاظ
 فارسی بہ ریزند و بہ گویند :

عرفی سے مشت سوزن بہ دلم زان مرثہ تا ریختہ اند
 گر بہ از پارہ دل دو خشتہ پیراہن چشم
 و بہ آں کہ بر سر مرثگان بے غم خود خاک بہ ریزند و آن گاہ دست دل خود را
 بگیریںد و بہ اتفاق او بہ گدائی روند تا قدر سے غم بہ دست آوند و در ادائے
 این معنی گویند :

خاک دیگر بر سر مرثگان بے غم می کنم
 دست دل می گیرم و در یوزہ عنہم می کنم " (نظیری)
 علی اکبر شہابی خراسانی نے "روابط ادبی ایرانی و ہند" میں لکھا ہے کہ اس ہندی طرز
 نے بعض ایرانیوں کو بھی متاثر کیا لیکن ایران کے بلند طبع اور صاحب ذوق لوگوں نے
 اس تقلید کو کبھی پسند نہیں کیا بلکہ
 شہابی نے "بک ہندی" کی خصوصیات میں :

"خیال بانی، مضامین باریک، افکار پیچ در پیچ، خیالات دور از طبیعت و
 استعارات و تشبیہات غیر لطیف و مخصوص بہ ذوق طبع ہندیان" اور
 "مبالغہ و اغراق و بے ہودہ کاری و تکلفات غیر مستحسن" پر زیادہ زور دیا ہے۔
 بہاولوں، اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں ایرانی اثرات نمایاں ہو گئے تھے یہ مغلوں کے

لے بہ حوالہ "روابط ادبی ایران و ہند"

سے روابط ادبی ایران و ہند (طبران) ص ۹۱

سے "مغلوں کے تعلقات ایران سے" از اے رحیم اسلامک پکچر خیدر آباد دکن ۱۹۳۳ء

حزب کے ان اعتراضات کے خلاف خان آرزو نے آواز بلند کی اور اس سلسلے میں دو اہم کتابیں تصنیف کیں (۱) تنبیہ الغافلین (۲) احقاق الحق۔ لیکن صہبائی کو اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے۔

تنبیہ الغافلین میں خان آرزو نے حزب کے دیوان چہارم پر اعتراضات کیے ہیں اور اس کے تقریباً چار سو اشعار کو غلط ٹھہرایا ہے۔ آرزو کی چند غلطیاں مطلع السعدین میں سیار کوئی مل وارتہ نے بھی بیان کی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حزب کی ایرانیت سے بہت مرعوب ہے۔

یہ سلسلہ ہمیں ختم نہیں ہو جاتا۔ حزب نے "تنبیہ الغافلین" کا جواب لکھا اور اس کا نام "رجم الشیاطین" رکھا۔ (نگارستان، ص ۲۱۳) لیکن یہ کتاب ناپید ہے اور جناب منوہر سہاے اور تو اس کے وجود ہی کے منکر ہیں۔

۱۲۶ھ میں مولوی امام بخش صہبائی نے قول فیصل کے نام سے بظاہر ایک غیر جانب دارانہ کتاب لکھی لیکن اس کی بھی طرز و روش سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی، حزب کی طرف ذاری پر تیلے ہوئے ہیں۔

صہبائی نے آرزو کے اعتراضات رد کیے ہیں اور حزب کی حمایت میں ایرانی شعرا سے استناد کیا ہے بلکہ لیکن بعض جگہ وہ بھی سپردالنے پر مجبور ہو گئے ہیں :

"نظار گیان این نسخہ دریافتہ باشند کہ صہبائی بیچ مداں کرمیت راجست بستہ در ہر مقام قصد آن دارد کہ قوجیبہ برائے کلام شیخ بہم رساند اما چہ کسند در امثال این مقامات سپہبری افکنند۔"

اس مباحثے میں اس زمانے کے تمام اہل علم نے حصہ لیا ہے : مردم دیدہ کے مولف نے آرزو کے بیش تر اعتراضات غلط قرار دیے ہیں۔ مرزا علی لطف نے بھی

لے ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں لکھی گئی۔

لے ملاحظہ ہو، غوامص سخن، (صہبائی) ص ۶۸۳، ۴۳۱۔

لے قول فیصل، لکھنؤ ایڈیشن، ص ۱۳۵۔

ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ چنانچہ گلشنِ ہند میں لکھتے ہیں :

”۱۱۴۷ھ میں کہ شیخ محمد علی حزیں علی الرحمۃ ایران سے شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے تو اس یگانہ روزگار کی ملاقات کو شاہ وگداسب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب ان کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے محبوب کی، آرزوہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوانِ شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعرِ سقیم ٹھہرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراضات جمع کر کے ایک رسالہ رکھا ہے اور نام اس کا تنبیہ الغافلین رکھا ہے۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البدۃ تشویش میں پڑتی ہے۔ یہیں توصاتِ نزاع معلوم ہوتی ہے۔ جب باریک بینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے۔“

خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی نے ایک مضمون حزیں پر جولائی ۱۹۰۹ء کے مخزن میں لکھا تھا اور اس میں بھی یہ ثابت کیا تھا کہ آرزو کے بعض اعتراضات کسی طرح بھی وقیع نہیں ہو سکتے۔ خان آرزو نے بھی حد کر دی ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے خاقانی کو بھی اپنے اعتراضات کی تیغ سے زخمی کیا ہے اور یہ محض اس لیے کہ حزیں نے خاقانی کو سند کے طور پر پیش کیا تھا۔

غالباً خان آرزو نے تنبیہ الغافلین کے بعد ایک اور چھوٹا سا رسالہ حزیں کی مخالفت میں احقاق الحق کے نام سے لکھا ہے۔ مولانا صہبائی نے اس کا جواب اعلاء الحق کے نام سے دیا۔ لیکن تمام اعتراضات کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ اعلاء الحق کا لب و لہجہ نہایت درشت اور تلخ ہے۔ خان آرزو کے متعلق لکھا ہے :

”معرکہ سازِ صہ لاف، عنانِ گستاخِ سوزی ہائے گزاف، تہمت زدہ

امتیاز باطل و حق، صاحب نسخہ احقاق الحق ہے۔

ہم نے ادھر جو مرزا علی لطف کا بیان نقل کیا ہے اس سے یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیے کہ حزب اور خان آرزو کی بخشِ صرف ذاتی اغراض کا نتیجہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حزب کی کم نگاہی اور آرزو کی ناگواری کی سطح کے نیچے ایرانی ہندی کشمکش کا فرما تھی۔ تذکرہ حسین میں صاف لکھا ہے کہ خان آرزو کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ حزب فارسی زبان ہند کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

آرزو اور حزب کی ملاقات کا لطیفہ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے اور سب اس پر متفق ہیں کہ آرزو وہاں سے دل شکستہ لوٹے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ میر محمد افضل ثابت اور آرزو نے حزب کے اس شعر پر اعتراض کیا :

ہر گہ کہ بہ یاد و ہنت غنچہ نشستم

اندیشہ مرا سر بہ گریبان عدم زاد

حزب ان "جاہلان ہند" کے اعتراض پر یہ کہہ کر چپ ہو گیا کہ ان کو فارسی سے کیا واسطہ۔

حزب کے اخلاق و عادات میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ اس کی آزاد منشی اور خود پسندی ہے۔ وہ خود کہتا ہے :

لائق مدح در زمانہ چون نیست

خویشتن را ہی سپاس کنم

شاہ عالم اور شجاع الدولہ خود اس کے گھر آتے تھے اور ادب اور تعظیم بجالاتے تھے لیکن وہ ہندوستانی امیروں کو اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ ان کی ملازمت اختیار کرے۔

۵۔ یکے از عقل زندلان کہ بایست گرفت دامن عاطفت شاہ عطا بخش و وزیر
آن یکے می دیم پند کہ در ہند مجھوے کام بے تربیت قدر شناسان امیر

۱۔ اعلا الحق، نظامی پریس، ص ۶۰۔ صاحب نسخہ احقاق الحق سے شبہ ہوتا ہے کہ صہبائی آرزو کو احقاق الحق کا مصنف نہیں سمجھتے۔

محمد شاہ کے زمانے میں ایرانیوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ بادشاہ نے کئی مرتبہ
 حزیں کو قلمدان وزارت پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔
 ایسا آدمی خان آرزو کی قابلیت کا کب معترف ہو سکتا تھا۔ آزاد نے ایک
 واقعہ نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے آرزو کی یہ غزل نئے فخر کے ساتھ حزیں کے سامنے پڑھی۔
 نجل آرزو سے جواب دیا کہ یہ این تنگی ظرف
 انجہ در کیسہ خود داشت بہ دریا بخشید
 حزیں نے فوراً اصلاح کی۔

نجل از چشم جہاںم کہ بہ یک ظرف تنگ
 آن چہ در کاسہ خود داشت بہ دریا بخشید
 اور کہا ”این بابا از کیسہ تا کاسہ و از تنگی و تنگی فرق نمی کند و باز خود را شاعر گوید۔“
 آزاد ہی نے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے جو دل چسپی سے خالی نہیں۔ آرزو کے
 ایک عقیدت مند (یعنی شاہ لطف اللہ) حزیں کے پاس پہنچے اور اپنا تعارف کرائے
 بغیر اس شعر کی درخواست کی۔

بتے دارم کہ باشد از حیا مٹا طلک ننگش
 حنا گر پایے او بوسد ز شوخی می پرور ننگش
 حزیں نے کہا: ”معلوم می شود کہ از کاسہ لیسان حرام زادہ اکبر آباد است۔“
 آزاد کے اکثر بیانات غلط ہیں چنانچہ یہ روایت بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی، اس
 لیے کہ شاہ لطف اللہ کا انتقال حزیں کے ہندوستان آنے سے قبل ہو چکا تھا
 لیکن ان قصوں سے حزیں اور آرزو کے تعلقات کی نوعیت عوام کی نظر میں
 ضرور معلوم ہو جاتی ہے۔

تذکرۃ الاحوال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حزیں کو اپنی قابلیت اور
 ایرانی النسل ہونے کا غیر معمولی احساس تھا اور ان کی بددماغی کبھی دوسرے کے

لے۔ بات قابل ذکر ہے کہ سیر المتاخرین کے معنیف کو حزیں سے بڑا غلو تھا۔

محاسن کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی بے

اس کے بعد ایرانی ہندی نزاع، معرکہ حامیان قتیل وغالب کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ مرزا غالب اپنا رشتہ ادبی دودہ جم سے جوڑتے تھے اور اس پر انھیں غیر معمولی فخر و ناز تھا۔ اس قسم کے اشعار ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں یہ

غالب بہ گہر ز دودہ زاد ششم

زاں رو بصفائے دم تیغ ست دم

گہر از رایت شاہان عجم بر چیسرند بعوض خامہ گنجینہ فشاخم دادند

افسر از تارک ترکان پشنگی بردند بہ سخن ناصیہ منبر کیا نم دادند

ساقی چمن پشنگی و افراسیابیم دانی کہ اصل گوہم از دودہ جم است

میراث جم کہے بود اکنوں بمن پیار زاں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

مرزا غالب، سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں :

"ترک نژاد و نسب من بہ افراسیاب و پشنگ می پیوندند"

جو شخص دودہ جم سے تعلق رکھتا ہو، وہ فارسی نویسان ہند کو کب حنا ط میں

لا سکتا تھا۔

غالب نے قاطع برہان میں اپنے آپ کو اہل زمان میں شامل نہیں کیا :

"حاشا کہ خود را از اہل زبان گیرم" لیکن انھوں نے اپنی زبان دانی کی سلاقی اور

راستی پر اتنا زور دیا ہے کہ وہ صرف اہل زبان ہی کو سراوار ہو سکتا ہے یا اس شخص

کو جس کے عجز میں ہزار غرور پوشیدہ ہوں۔

غالب کا دعویٰ یہ ہے کہ زبان فارسی سے ان کو "پیوند ازلی" ہے اور ایک

"جاما سپ عہد" اور "بزر چہر عصر" کے سامنے انھوں نے زانوے ادب بھی تکیا تھا۔

لے نیز ملخص ہو پروفیسر سید حسن عسکری، پتہ) کا مقالہ "شیخ علی حزیں پر کچھ نئی روشنی" جو انھوں نے

۱۹۳۷ء میں انڈین مہترسی کانگریس آباد میں پڑھا تھا اور جناب سرفراز خاں صاحب کا مقالہ

شیخ محمد علی حزیں پر۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

”ملا عبد الصمد (ہرمزد) استاد غالب (غیر معمولی علم و استعداد کا شخص تھا۔ بلاشبہ مرزا غالب کی غیر معمولی فارسی مناسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بڑا دخل ہوگا.... عبد الصمد پر سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتے کا راز کھل چکا تھا۔ دونوں زبانوں کے مرادفات کی صحیح مثالیں اسے معلوم تھیں۔ سرولیم جونز وغیرہ کے ابتدائی مباحث میں انھیں سے کام لیا گیا ہے۔“

ملا عبد الصمد کا وجود تھا یا نہیں۔ یہ مسئلہ بڑا مباحثہ انگیز ہے لیکن خود غالب کا بیان یہ ہے کہ اس کی مدد سے فارسی زبان کی حقیقت ”دل نشین“ اور ”خاطر نشان“ ہو گئی۔ لیکن اس معاملے میں انھوں نے اتنا غلو کیا کہ وہ اپنے آپ کو فارسی کا تنہا وارث سمجھتے تھے اور ابتدا ہی سے ہندوستان کے متقدمین و متاخرین فارسی دانوں میں سے ایک آدمہ کو چھوڑ کر باقی کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ شاید اس سے بہتر مثال نہ مل سکے۔

ہر چند زمانہ مجمع جہاں است وز جہل نہ حال شاں بیک موال است
کو دن ہمہ لیک ازی کے دگرے فرق خیر عیسیٰ و خیر جہاں است
معمر کہ حامیان قلیل و غالب اسی ایرانی ہندی نزاع کی ایک کڑی ہے۔
غالب کی قلیل دشمنی کو اگر اس پس منظر کے ساتھ دیکھا جائے تو ان کے انکار و امیال اور موافقت و مخالفت کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جاسکتی ہیں۔

اس ادبی ہنگامے کے برپا ہونے کا فوری سبب یہ ہوا کہ مرزا غالب اپنی پیشین کے سلسلے میں ۱۸۶۲ء میں کلکتہ پہنچے۔ وہاں ایک شاعرے میں غالب نے ”گماں برخیزد“ ”میاں برخیزد“ غزل پڑھی۔ اس غزل کا ایک شعر ہے :

۱۔ ”غالب“ از غلام رسول مہر : ۲۷۔

۲۔ دیکھیے ”غالب کا ایک فرضی استاد“ علی گڑھ میگزین ”غالب نمبر“ : ۶۵۔

۳۔ ملاحظہ ہو، غالب نامہ، ع ۳۲۔

جزد از عالم و از ہمسہ عالم بیشم
ہم جو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عالم مفرد ہے، ہمہ کے ساتھ اس کا ربط بہ اجتہاد قلیل درست نہیں ہے۔ کفایت خاں رئیس ہرات بھی شاعرے میں موجود تھے۔ انھوں نے ”ہمہ عالم“ کی سند سعدی و حافظ کے کلام سے پیش کی لیکن اس سے مخالفین کا اطمینان نہیں ہوا۔ دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ ”ز میاں برخیزد“ صحیح نہیں ہے۔

تیسرا اعتراض ”کہہ“ کے استعمال پر تھا۔

غالب نے ان اعتراضات پر حل کر کہا کہ ”میں فرید آباد کے کھتری بیچے کا قول نہیں مانتا۔“ کلکتہ میں غالب کے معترضین کی تعداد کافی تھی اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ عبدالغفور نساخت نے یہ نکھی ہے کہ کلکتہ کے قیام میں غالب کا بلنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں سے تھا۔ ان لوگوں نے ان کے کلام کی خاطر خواہ تعریف و توصیف کی۔ بلکہ کفایت خاں نے کلکتہ کے شاعروں کو چھوڑ کر صرف غالب ہی کی قدر افزائی کی۔ حاجی عبدالکریم اصفہانی کلکتہ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کے یہاں ایک ایرانی فاضل مرزا کو چک نام مقیم تھے۔ انھوں نے مجلس عام میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا: اس درجہ کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں۔ یہ باتیں مخالفین برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

غالب نے اس واقعہ کی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو اس طرح اطلاع دی ہے:

”از نوادر حالات ایں کہ سخن دران دیکتہ رسان ایں بقعہ پس از ورود
خاکسار بزم سخن آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمسی انگریزی روزیک مشنبہ
خستین سخن گویاں در مدرسہ سرکار کمپنی فراہم شدندے، وغرہاے
ہندی و فارسی خواندندے ناگاہ گراں مایہ مردے کہ از ہرات بہ سفارت

لے ملاحظہ ہو، غالب نامہ، ص ۳۲

لے غالب از مہر، اشاعت سوم، ۱۳۳۰ ہ روایت مولانا ابوالکلام آزاد۔

رسیدہ است در آں انجمن می رسد و اشعار مرا شنوده بہ بانگ بلند نامی سائد
و بر کلام نادرہ گویان این قلم رو تبسم ہائے زیر لبی می فرماید چون طبائع
بالذات مفتون خود نمائی است ہم گناہ حسد می برند و کلانان انجمن و
فرز انگان فن برد و بیت من اعتراض نادرست بر آورده آں را شہرت
می دہند۔

مرزا غالب نے اعتراض سے تنگ آکر ایک مثنوی "بادِ ممانت" لکھی جس میں
سخن بردارانِ طلعت سے معذرت کی لیکن اس مصاحبت میں بھی کئی بے زلفی چھپے ہوئے تھے،
بکھتے ہیں: 'نہ میں نے فنیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا، نہ اس کی شہرت پر رشک ہے
نہ اسے برا کہتا ہوں لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ:

دا من از کف انم چگونہ رہا	طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح رواں معنی را	آن ظہوری جہان معنی را
آں کہ طے کردہ ایں واقعہ را	چہ شناسد قتیل و واقف را
می شوم خویش را بصلح دلیل	می سرانم نواسے مدح قتیل
تا نہ ماند زمن دگر گلہ	رسد از پیردان دے صلہ
گرچہ ایرائیش نہ خواہم گفت	سعدی ثنائیش نہ خواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است	از من دہم چو من ہزار بہ است
من کہ خاک داد سپہر بلند	خاک را کہ رسد بہ چرخ بلند

۱۔ کلیات نثر غالب: ۱۴ (نول کشور ۱۲۸۴)۔ خطوط نام عبدالغفور سرور اور عبدالرزاق شاہ کراچی
دیکھے جائیں: عود ہندی صفحات: ۱۴، ۱۵ (طبع علی گڑھ ۱۹۲۴)۔

۲۔ نیز ملاحظہ ہو "بادِ مخالف" کی اولین روایت "از قاضی عبدالودود۔ بڑے تماشے کی بات یہ ہے کہ
غالب، قتیل کی بڑی تعریف کرتے ہیں، جو طبع ہی بھی، مگر اس کی سند اس بنا پر کہ وہ ہندی ہے قبول
نہیں کرتے۔ مگر قتیل کی سند خود پیش کرتے ہیں۔ "شعر بیدل بجز تفتن نیست" اولین روایت
میں نہیں، بعد کو بیٹھا ہے۔

دست او حد چو منے نہ بود بہر در خورد و در دزنے نہ بود
 مرجاساز خوش بیانیے او حجاز شور نکستہ دانیے او
 نظمش آب حیات راماند در روانی فرات راماند
 نثر او نقش بال طاوس است انتخاب صراح و قاموس است
 بادشاہے کہ در قلم رد حوت کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرت
 خام بند وے پارسی دانش ہندیاں سر بہ خط فرانش
 این رقم ہا کہ ریخت کلاک خیال بود سطرے ز نامہ اعمال
 از من نار سائے بیج مداں معذرت نامہ ایست لے یاراں
 بوکہ آید ز عذر خواہی ما رحم بر ما و بے گناہی ما
 آشتی نامہ و داد پیام ختم شد و اسلام والا کرام

غالب کی پریشانیوں میں پیش کش کے مقدمے کو بڑا دخل حاصل ہے جس میں وہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۴۴ء تک اُلجھے رہے اور روپیہ ملنے کی امید میں قرض لیتے رہے۔ ۱۸۴۶ء میں وہ ”غم رسوائی جاوید“ یعنی قید فرنگ میں مبتلا ہو گئے۔

غرض غدر کے زمانے تک ان کو اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ ہمنویانِ قسطل کے خلاف کوئی موثر قدم اٹھا سکیں۔

غدر کے زمانے میں مرزا غالب نے ایک روز نامچہ ”دستنبو“ کے نام سے لکھا اس میں انھوں نے خالص فارسی میں ”جہاں دارانِ داد آموز“ دانش اندوز، نکو خو، نکونام“ (انگریزوں) کی تباہی اور بربادی کا بھی ذکر کیا ہے اور یکم اگست ۱۸۵۸ء تک کے حالات جمع کیے ہیں۔ غدر کی خانہ نشینی ہی کے زمانے میں انھوں نے ’برہانِ قاطع‘ دیکھنا شروع کی اور اس کے اغلاط نوٹ کرتے رہے۔ غالب نے ان کو ایک علاحدہ رسالے کی صورت میں ۱۸۶۰ء میں مرتب کیا اور ۱۸۶۲ء میں چھپوایا۔

لے قاطع برہان، کا دوسرا ایڈیشن ’درفش کاویانی‘ کے نام سے مع اضافہ مطالب و فوائد ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔

قاطع برہان کی اشاعت نے ۱۸۲۹ء کے کلکتہ والے ہنگامے کو پھر تازہ کر دیا۔ قول غالب ”باسی کڑھی میں اُبال آگیا“ اور ان کو آخر وقت تک اس مخالفت سے نجات نہیں ملی۔

‘قاطع برہان‘ ایسی ہنگامہ خیز کتاب تھی کہ کچھ عرصے کے لیے ساری فضا مکدر ہو گئی اور مخالفانہ لٹریچر کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) ‘محق قاطع‘ (مولوی سعادت علی خاں)

(۲) ‘ساطع برہان‘ (مرزا حیم بیگ میرٹھی)

(۳) ‘قاطع القاطع‘ (امین الدین پٹیلوی)

(۴) ‘مؤید برہان‘ (آغا احمد علی)

(۵) ‘تبع تیز تر‘

(۶) ‘شمشیر تیز تر‘ (آغا احمد علی)

اس مخالفانہ لٹریچر کا جواب غالب کے دوستوں اور مؤیدوں کی طرف سے ان کتابوں کے ذریعے دیا گیا۔

(۱) ‘دافع بذیان‘ (مولوی نجف علی)

(۲) ‘لطائف غیبی‘ (سیف الحق تیاچ) تہہ کا قیاس ہے کہ یہ کتاب غالب کی لکھی ہوئی ہے۔

(۳) ‘سوالات عبد الکرم‘۔

(۴) ‘نامہ غالب‘ از مرزا غالب

(۵) ‘تبع تیز‘ مولفہ غالب

(۶) ‘ہنگامہ دل آشوب‘ وغیرہ۔

اس معارفی تلخی کا پیدائہ ہونا حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ موافق و مخالف دونوں جماعتیں نا ملائم الفاظ پر اُتر آئیں اور طنز اور دشنام کے ترکش کا کوئی تیسرے

۱۔ غالب: ۴۳۱ اشاعت سوم، نیز ملاحظہ ہو: علی گڑھ میگزین غالب نمبر،

لطائف غیبی اور غالب از عبد المجید سالک: ۱۲۳

ایسا نہیں تھا جو انھوں نے صرف نہ کیا ہو۔

اس تمام لڑبڑ کو اس نظر سے جانچنا اور پرکھنا کہ غالب کے اعتراضات کہاں تک درست تھے، تحقیق کا ایک دلچسپ موضوع ہے اور اس کے لیے ایک علاحدہ فرصت درکار ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ایرانی ہندی نزاع کے سلسلے میں اس کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔

اگر جذبات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ غالب نے قاطع برہان لکھ کر علمی خدمت انجام دی اور اس ایرانی ہندی نزاع کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اب تک تشنہ بحث تھے۔

رضا علی خاں ہدایت صاحب مجمع الفصحا نے فرہنگ انجمن آراءے ناصری میں غالب کے بعض اعتراضات کو صحیح مانا ہے۔ لیکن اس بحثا بحثی میں ذاتیات پر حلے ہونے لگے اور رفتہ رفتہ اس مباحثے کی علمی اور تحقیقی حیثیت ختم ہو گئی۔

مرزا غالب شروع ہی سے قلیل و واقف کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنے آپ کو عرفی و ظہوری کا ہم مرتبہ سمجھتے تھے۔ کلکتہ کے مشاعرے اور برہان قاطع کے ہنگامے نے غالب کے جذبہ مخالفت میں شدت اور عصبیت پیدا کر دی۔ ان کی مخالفت کا یہ عالم تھا کہ جس سے بھی قلیل کا تعلق سن پاتے تھے، اس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ مولوی غیاث الدین رام پوری مولف غیاث اللغات نے قلیل کی چار شہرت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ غالب اس تعلق کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

”غیاث الدین رام پوری ایک ملائے ملکیتی تھا۔ ناقل ناماقل۔ جس کا ماخذ

اے قاضی عبدود صاحب کا خیال ہے کہ ان مسائل کے بارے میں جو غالب اور حامیان برہان قاطع میں مابہ النزاع ہیں، ہدایت نے جو کچھ لکھا ہے (فرہنگ نگار کی حیثیت سے، نزاع کی طرف اشارہ کیے بغیر) اور اس سے کسی قسم کی واقفیت کا اظہار کیے بغیر، وہ استی فی مسد وہی ہے جو برہان میں ہے۔

اور مستند علیہ قلیل کا کلام ہوگا۔ اس کا فن لغت میں کیا فرجام ہوگا؟^۱
مولوی غلام امام شہید چونکہ قلیل کے شاگرد تھے اس لیے ان کے متعلق
ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں:

”سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قلیل وہاں کوں اناد لاغیری
بجارتے ہیں اور سخن ناشاسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔“
غالب ہر جگہ قلیل کو ہندی فارسی دانوں کا نمائندہ اور اپنے آپ کو فارسی دایان
ایرانی نژاد کا علم بردار سمجھتے ہیں:

”یہ فارسی لالہ قلیل کی ہے۔“ ”ایک گاؤں بچہ بہ روز سحر کچھ باتیں کرنے لگا۔
بنی اسرائیل اسے خدا سمجھے۔“

”قتیل اساتذہ سلت کے کلام سے قطعاً نا آشنا ہی نہیں اس کے علم فارسی
کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں
ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیش تر
سادہ کشمیری یا کابل یا قندھاری و مکرانی۔ احياناً عامہ اہل ایران میں سے
بھی کوئی ہو، مانا غلط ہے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے تحریر
اور ہے۔ اگر تقریر بہ عینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطواط اور شرف الدین
علی یزدی اور ملا حنین واعظ کاشفی اور طاہر وحید یہ سب شعر میں کیوں
خون جگر کھاتے۔ وہ سب اسی طرح کی شعر میں جو لالہ دیوالی سنگھ قلیل
متوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہے، رقم نہ فرماتے تھے“
صاحب عالم کو لکھتے ہیں:

”اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قلیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا، رہا سہا غیاث الدین۔“

۱۔ خطوط غالب، ص ۱۱۷۔

۲۔ اردو سے مولیٰ: ۳۷۸ (لاہور ۱۹۳۰ء)۔

۳۔ خطوط غالب: (بنام قاضی عبدالجلیل)۔

۴۔ عمدہ ہندی، ۱۵ (طبع علی گڑھ) عبد الغفور سرور کے نام۔

راپوری نے کھو دیا۔ غور کرو کہ وہ خزان نامشخص کیا کہتے ہیں، اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قلیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔۔۔۔ ان غولوں پر لعنت کرو۔“

قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں :

”مگر یہ پیروی قلیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریب کے موافق تحریر بنا رہا ہے۔“
تفتہ کو لکھتے ہیں :

”لفظ ”بے پیر“ تورانی بچہ ہاے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے مرزا جلال شیر علیہ الرحمہ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادہ ایران ایسا لفظ لکھے۔“

مرزا غالب یہ سمجھتے تھے کہ زبان دانی، فارسی میری ازلی دست گاہ ہے اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے اس لیے اگر کوئی غلطی ان کی دانست میں ایرانیوں سے بھی ہوئی ہے تو اس پر بھی تعجب کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور موقع پر تفتہ کو لکھتے ہیں :

”فارسی میں مبداء، فیاض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط

لے عود ہندی : ۲۲

۲۵ اردوئے معلیٰ : ۳۰۳

۳۵ خطوط غالب : ۱۹ حالانکہ بے پیر بہت قدیم ترکیب ہے۔ خاقانی، طالب آملی، صائب اور اشرف کے یہاں موجود ہے (”غالب بہ حیثیت محقق“ علی گڑھ مسکین۔ غالب نمبر : ۱۹۰)۔

۳۵ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو راز تقلید کے قائل نہیں تھے۔ حزیں کے ایک مطلع کا ذکر کرتے ہوئے تفتہ کو لکھتے ہیں : ”حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زاید اور بے ہودہ ہے۔ منبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ ستم ہے، یہ عیب ہے، اس کی پیروی کون کرے گا۔ حزیں تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہوتا تو اس کو سند نہ جاتا۔“ (خطوط غالب : ص ۲۳)۔ وہ مطلع یہ ہے :

ز ترک تازی آں نازین سوار ہنوز ز سبزہ می ودا انگشت رہنبار ہنوز

اسی خط میں لکھتے ہیں : ”نظر گفتن“ اور ”گوش گفتن“ ہم نہیں جانتے اگرچہ منشی بزرگ بال تفتہ اور ملا نور الدین ظہوری نے لکھا ہو۔“ (خطوط غالب : ص ۲۲)

میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر ہے۔

”سنو میاں، میرے ہم وطن جو وادی فارسی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو نخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں، جیسا وہ گھسا گھسے اور عبدالواسع لفظ نامراد کو غلط کہتا ہے اور یہ آؤ کا پتھا قلیل ”صفوت کدہ“.... اور ”ہمہ عالم“ کو غلط کہتا ہے، کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو ”یک زبان“ کو غلط کہوں گا۔ فارسی کی میسزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے، اللہ الحمد و اللہ اشکر علیہ۔“

یہی وجہ ہے کہ غالب ہندوستان کے سخن وروں میں سوائے خسرو کے اور کسی کو مسلم الثبوت نہیں سمجھتے تھے۔ سرور کو لکھتے ہیں :

”میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و امیر و جزین کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم و نثر میں نہیں لکھتا۔“

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں :

”کلام سعدی و جزین اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے۔ نہ آرزو اور واقف اور قلیل وغیرہم کا۔“

غالب کی دلی

غالب کی دلی عالم میں انتخاب تھی۔ مرسول اسر کے الفاظ میں چین کے ساحل سے لے کر قسطنطنیہ تک کوئی شہر دیدہ و دانش میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صرف شہر نہیں ایک بڑی تہذیب کا مرکز اور علم و فن کا گہوارہ تھا۔ ہماری گنگا جمنی تہذیب نے یہیں بدورسش پائی تھی۔ معمولی بولیوں کو ادب کی کرسی نشینی کا شرف یہیں حاصل ہوا تھا۔ گیسوئے اردو یہیں سنوارے گئے تھے۔ حاتم سے لے کر حالی تک تمام اسالیب یہیں وجود میں آئے تھے۔ یہیں تصوف نے انسانیت اور دردمندی کا ایک وسیع تر تصور پیش کیا تھا۔ علم حدیث نے یہیں ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کی تھیں۔ علم طب نے یہیں میمانی کی تھی۔ یہیں علم و ادب کی شمع کو اُس شان سے فروزاں کیا گیا تھا۔ کہ دور دور تک تاریکیاں بچھٹ گئیں۔ یہیں علم دین و شعر و حکمت، طب اور تاریخ و نجوم میں وہ معیار قائم کئے گئے کہ غرناطہ و بغداد کی یاد تازہ ہو گئی۔

سلطنت مغلیہ کی حیثیت ایک عظیم الشان درخت کی سی تھی جس کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بہادر شاہ اول کے زمانے سے لے کر

نادر شاہ کے حملے تک اس کے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تو رہے لیکن اس کی جڑوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ مغلوں کی بربادی دراصل ۱۷۳۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ نادر شاہ کے حملے نے ان کی مکر توڑ دی اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ "از سلطنت بجز نامے باقی نماند"، نادر شاہ نے ہندوستان کا وہ ستھر اویا کہ سڑکوں پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ بستیاں ویران اور بے چراغ ہو گئیں۔ ایک وقت تو ایسا آگیا تھا کہ مسلمانوں نے جوہر کی رقم ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مال غنیمت بھی جو ہاتھ لگا اس کی مالیت اکٹھا کر دوڑے کم نہ تھی۔ یہ دولت ایک دن کی نہیں، اکٹھا پیڑیوں کی جمع کی ہوئی تھی۔ آنند رام مخلص کا خیال ہے کہ صرف جوہرات کی قیمت پچاس کروڑ سے زیادہ ہوگی۔ جان کا نقصان اس سے زیادہ تھا۔ ایرانی مورخین کا اندازہ ہے کہ اس ہنگامہ و آشوب میں تیس ہزار سے کم آدمی تہ تیغ نہ ہوئے ہوں گے۔

نادر شاہ کی غارت گری کے بعد لوٹ کھسوٹ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جاٹ مرہٹے۔ روہیلے اور فرنگی سب ہی ظلم و ستم پر آمادہ تھے۔ ہر چرن داس مصنف گلزار شجاعمی نے جاٹ گردی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی غارت گری سے ڈر کر دہلی کے باشندے اس طرح مارے مارے پھرتے تھے جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے تھپیڑے کھا رہا ہو۔ مرہٹوں کے متعلق گنگا رام نے لکھا ہے کہ وہ دیہاتوں کو لوٹتے۔ لوگوں کے ہاتھ ناک، کان کاٹ لیتے اور خوب صورت عورتوں کو رسیوں میں باندھ کر لے جاتے۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک نو مرتبہ ہندوستان کو زیر و بر کیا اور کوئی چیز خوردنی اور پوشیدنی نہیں چھوڑی تھیں گرا دیں۔ کسی کے گھر میں بلو کشش ستر اور قوت یک روزہ بھی باقی نہیں رہی۔

ان طوفانوں میں عوام خس و خاشاک سے زیادہ مجبور اور بے دست و پا تھے ہرزبر دست کے ٹھوڑے ان کے کھیتوں کو پا مال اور ہرجا برامیر کے سپاہی

ان کے گھروں کو بے چراغ کر سکتے تھے۔ روزی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔
 صبح کو لی تو شام کی خبر نہیں۔ دست کار، صنایع، کسان، مزدور، وضع و
 شریف سب ہی پریشان اور مضطرب تھے۔ کی زمین کے کم ہو جانے سے
 خود شاہی خاندان پر تین تین وقت کے فاتے گزرتے تھے اور ”سلاطین“ کی
 حالت فقیروں سے بھی بدتر تھی۔ نہ جسم پر کپڑا تھا اور نہ پیٹ میں روٹی۔
 مرزا رفیع سودا نے شہر آشوب میں لکھا ہے کہ اب نوکری نہیں ملتی۔ اگر
 گھوڑا جو کوتل اور مزہرا ہے لے کر گئے بھی اور نوکری مل بھی گئی تو تنخواہ نہیں
 ملتی۔ افلاس کا یہ عالم ہے کہ علف و دانہ کی خاطر
 شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے
 سودا کا شعر ہے۔

روپیہ کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے
 کہ اس زمانے میں چٹلنے ہے وہ یا گول

سال سال بھر کی ملازمت کے بعد بھی ایک جہ تنخواہ کا وصول نہیں ہوتا۔
 سپاہیوں پر ہی موقوف نہیں ہر پیشے شاعری و ملائی، خطاطی و صنایع سب
 کا یہی حال تھا۔ جاگیر داری اور اجارہ داری کی لعنتوں نے آسائش اور اطمینان
 ختم کر دیا تھا۔ سیاسی انتشار اور اقتصادی بد حالی کے اس اندھیرے میں
 انگریز جن کے پیچھے صنعتی انقلاب تھا اور تاریخ کی بڑھتی ہوئی قوتیں تھیں۔
 اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما رہے تھے۔ ہندوستان کی ٹوٹ ہی سے ان
 کے مشینی انقلاب میں جان پڑی تھی۔ مصحفی نے لکھا ہے۔
 ہندوستان کی دولت و شہرت جو کچھ کہ تھی

کافر فرنگیوں نے تہہ بے تہہ کنجھ لی

انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں بنگال پر اور ۱۸۵۹ء میں میسور پر قبضہ کر کے
 ہماری اقتصادی شرک کو کاٹ دیا تھا۔ اور وہ روز بروز اس مامن و ف

یعنی دہلی کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ بقول مصحفی:

عمر بس قلعہ کے نیچے ہی لگ ایک امن داماں ہے

چنانچہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دہلی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر اور نابینا شاہ عالم کو جس کی حکومت بلاامبالغہ دہلی سے پالم تک باقی رہ گئی تھی مرہٹوں سے لے کر اپنے قبضہ میں کر لیا۔ سر جی ادرجن گھانو کے صلح نامے کی رو سے سندھیانے دواب کا سارا علاقہ مع آگرہ اور دہلی کے، انگریزوں کے سپرد کر دیا اور وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے کبھی شانِ عجم اور شوکتِ ردم حقیر معلوم ہوتی تھی نیست و نابود ہو گیا اور اکبر شاہ ثانی کے متعلق یہ جملہ ضرب المثل بن گیا تھا۔

”اکبر شاہ ثانی۔ چو لھے آگ نہ گھرے پانی“ دورانِ تیموریہ کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں مغلوں کی حکومت لفظاً اور معنیاً سمٹ کر قلعہ کی چہار دیواری تک رہ گئی تھی۔

لیکن دہلی مٹنے پر بھی ہندوستان کا قلب و جگر اور ایک عظیم الشان تہذیب کی نشانی تھی۔ ہر طرف اسی کی تہذیب کا سکہ رواں تھا اور حضرت دہلی کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ ۱۸۱۳ء بلکہ اس کے بعد بھی ہندوستان کے فرماں روا اور راجے جہاں راجے اپنی تخت نشینی کو اُس وقت تک قطعی نہیں سمجھتے تھے جب تک دہلی کے مجبور اور بے دست و پا بادشاہ کی مہر و توثیق ثبت نہ ہو جائے بلکہ

ان انتشاری رجحانات سے یہ سمجھنا کہ اس زمانے کی تاریخ محض شور و شہ پسنیدی یا عیش و کوشی کی داستان ہے یا اس زمانہ کا ادب، رات اور زلف کی کہانی ہے، صحیح نہیں ہے۔ اجتماعی انحطاط اور سیاسی زوال کے

متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ابھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ وقت کی ان عام مایوسیوں میں غیرت اور شجاعت - ایثار و کرم - علم و فن - محبت اور رواداری کی حیرت انگیز مثال مل جاتی ہیں۔ غالب کی زندگی اور شاعری کو اسی سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس بڑے نقشہ میں بادشاہوں اور امیروں کی غلطی یا رنگین مزاجی اتنی اہم نہیں جتنی غالب کی حکیمانہ ذہانت اور شگفتہ متانت - تاریخ میں ایک محمد شاہ، ایک ابوالسحاق، ایک لونی شانزدہم ہمیشہ ہوا ہے۔ اس کی پرچھائیں اور اس کا نعرہ داتے ہوئے درادیر میں خضا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ لیکن جس چیز کو زوال نہیں وہ اس زوال پذیر معاشرہ میں غالب کا ثبات قدم، بیٹنے کا سلیقہ اور اقدار عالیہ پر ایمان محکم ہے۔

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ ”مخلوں کے جاہ و جلال کا اصل گہوارہ شاہ جہاں آباد تھا لیکن عجیب اتفاق ہے کہ نہ صرف ان فن تعمیر کا شاہکار اکبر آباد میں ہے بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر اور ان کی تہذیب و تمدن کے بہترین ترجمان کامل ولد بھی وہی بلدہ حسن و شعر ہے۔“

مرزا اسد اللہ خاں غالب شب، ششم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۶ء کو اگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں بیرونہ زمین ہوئے ان تہتر برس اور چار مہینے کی داستان ہمارے خطبات کا اصل موضوع ہے جس کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) غالب کی ولادت سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک اور

(۲) ۱۸۵۷ء سے غالب کی وفات تک

غالب ارض تاج میں پیدا ہوئے جہاں محبت کی سب سے بڑی یادگار ایک

نواب مرمریں کی شکل میں موجود ہے۔ یہیں غالب کی حسیں اور ذہن شاعری کی ابتدا ہوئی جس کا ہر نقش فریادی ہے اور ہر شعر ہلکوں سے ڈھلکتا ہوا آنسو

مرد جوں اشک از سرمہ صفاں چکیدہ نم بنگر

انگرہ، راجستھانی اور برج بھاشا کے سنگم پر واقع ہے۔ یہاں کی زبان نے اردو کی تشکیل میں جو کھڑی پولی کی نکھری ہوئی شکل ہے نمایاں حصہ لیا ہے۔ مرزا غالب کی والدہ اسی شہر انگرہ کے ایک معزز گھرانے کی تھیں۔ وہ پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ ریاست الود میں مارے گئے۔ یتیم ہونے کے بعد ان کی نگرانی ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو اس وقت مرہٹوں کی طرف سے انگرہ کے گورنر یا صوبے دار تھے۔ جب لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر انگرہ پر قبضہ کر لیا تو یہ بے روزگار ہو گئے اور ان کی جگہ ایک انگریز کمشنر مقرر ہو گیا لیکن نواب احمد بخش خاں نے جن کی بہن مرزا نصر اللہ بیگ سے منسوب تھیں اور جن کے لارڈ لیک سے دوستانہ مراسم تھے ان کو کہہ سن کر انگریزی فوج میں چار سو سوار کا رسالہ دار مقرر کر دیا اور دو پر گئے بھی ذات اور سوار کے خرچ کے لیے عنایت ہوئے لیکن ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ نصر اللہ بیگ خاں کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالب نے یہ ابتدائی زمانہ اپنے چچا کے یہاں نہیں بلکہ نانا کے یہاں گزارا۔ مولانا حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں ”مرزا عبداللہ بیگ نے بطور خزانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی“

افسوس ہے کہ ہمیں غالب کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کی ننھیال بہت آسودہ حال تھی اور انگرہ میں انہیں ہر قسم کی آزادی اور آسائش میسر تھی۔ منشی شیونرائن کے خط میں انھوں نے اپنے شطرنج کھیلنے اور بلوان سنگھ (مشہور و معروف راجہ جیت سنگھ کے بیٹے)

کے ساتھ پتنگ لڑانے کا ذکر کیا ہے۔ اور مہر نیم روز میں اپنی اس بے ہودہ کوشی اور اوباشی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ آہ زمرے کے گزشتہ ایس چنیں۔ تذکرہ سرور میں جو غالب کے قیام آگرہ کے بہت اہم ماخذ میں سے ہے لکھا ہے۔ اسد اللہ خاں اسد عرف مرزا نوشہ، مولد کش اکبر آباد، جو اس قابل، یار باش در خاطر متمکن غم ہائے عشق مجاز، تربیت یافتہ غم کدہ نیاز، آگرہ میں غالب کا ماحول شاہد و شعرو شراب کا تھا لیکن اس بہو و لعب کے باوجود انھوں نے مرد و جہ تعلیم بھی حاصل کی اور منطق و فلسفہ ہنیت اور طب میں اچھی خاصی دسترس بہم پہنچالی تھی۔ فارسی سے انھیں مناسبت اصلی تھی۔ تذکرہ گلشن بے خزاں میں لکھا ہے کہ انھوں نے شیخ معظم اور نظیر اکبر آبادی سے بھی درس لیا تھا۔ مرزا غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے فارسی کے غوامض ملا عبد الصمد ہر مرزے سے جو جا ماسب عہد اور بزرگ عمر تھا، دو برس تک سیکھے لیکن مولانا حالی کے برخلاف قاضی عبد الودود کا خیال ہے کہ ملا عبد الصمد فرضی نام ہے اور اس کا کوئی وجود خارجی نہیں تھا۔

مرزا غالب کی ننہیاں کتنی ہی آسودہ ہو اور ان کے ساتھ کتنا ہی اچھا سلوک کیوں نہ ہوا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے والد کی حیثیت خانہ داماد کی تھی اور اس کی وجہ سے گرد و پیش کی جاہ و ثروت کو دیکھ کر ان کے دل میں ایک خاص باطنی خلش ضرور پیدا ہوتی ہوگی۔

تیرہ برس کی عمر میں مرزا غالب کی شادی ذوق کے کھٹاگرہ اور نواب احمد بخش خاں کے بھائی مرزا الہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہو گئی اور اس طرح ان کا تعلق دہلی کے ایک ایسے ممتاز گھرانے سے قائم ہو گیا جو نہ صرف دولت مند تھا بلکہ شعروادب میں بھی ذمی حیثیت تھا۔

غالب پانچ چھ سال کی عمر سے دہلی آتے جاتے تھے لیکن پندرہ سولہ برس کی عمر میں مستقلاً دہلی میں اقامت گزین ہو گئے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ آنے جانے کا سلسلہ رہا۔ انھوں نے منشی شیونراتن کو جو خط اپنی پتنگ بازی کے ذکر میں لکھا ہے وہ اٹھارہ انیس برس کی عمر کا واقعہ ہے۔ غالب کے چچا نصر اللہ خان کے انتقال کے بعد ان کی پنشن نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں شامل ہو گئی تھی اور وہی ان کے دربار کے کفیل بھی تھے۔ دوسرے ان کی بھتیجی سے غالب کی شادی ہو گئی تھی اس لیے وہ اگر ہجھوڑ کر دلی میں رہنے لگے تھے۔

غالب اس زمانے میں دلی آئے جب دہلی میں نسبتاً امن چین تھا۔ بقول مولانا حالی ”حسن اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہ جہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں:

ہند را خوش نفسا ند سخنور کہ بود
باد در خلوت شاں مشک فشاں اندام شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی دانگاہ
حسرتی اشرف و آزرده بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں گر چہ نیر زرد بشمار
ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شاں

مولانا حالی نے اس کے بعد لکھا ہے:

”اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس بارغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے

بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا۔^{۱۷}
 سرسید نے تذکرہ اہل دہلی میں لکھا ہے:
 ”ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہندو کا گلدستہ
 ہے۔“

مصر کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا کو اعتراف کرنا پڑا کہ اگر ہندی علماء علم حدیث کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو یہ علم ختم ہو چکا ہوتا۔ ان محدثین میں حضرت شاہ عبدالعزیز کا نام نامی خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہے۔ ان کا یہ احسان معمولی نہیں ہے کہ انھوں نے انگریزی علوم سیکھنے کی ترغیب دی لیکن اسی کے ساتھ انگریزی تسلط کی مخالفت بھی کی اور اس پورے علاقے کو جو لارڈ لیک کی فتح یا بی کے بعد انگریزوں کے زیر نگیں آگیا تھا دارالحرپ قرار دیا یہ انھوں نے قومیت کا وسیع تر تصور پیش کیا جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کرشن جی عارف باللہ ہیں اور خدا کو پریشور کے نام سے بھی یاد کیا جاسکتا ہے۔^{۱۸}

۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے اپنے قدم دہلی میں جما لیے تھے۔ اس دہلی میں جس کے متعلق شاہ عبدالعزیز نے لکھا تھا کہ دوسرے شہر اور بلا دکنیز میں اور لونڈیاں ہیں اور دہلی مالک اور رانی۔ یہ موتی اور باقی سب کے سب سپیاں۔“
 دہلی مٹنے پر بھی ہندوستان کا دل تھی اور اس کے علما کی راست روی اور غیرت قومی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہو۔ ان کا فتویٰ جہاد نہ مرہٹوں کے خلاف تھا نہ سکھوں کے۔ حالاں کہ ان دونوں طاقتوں کا اثر بہت دور تک پھیل گیا تھا ۱۸۴۵ء میں رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد

انگریزوں نے پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد جہادی تحریک کا رخ کلیتاً انگریزوں کے خلاف ہو گیا اور ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک انگریزوں نے بیس دفعہ ۶۰ ہزار لشکر کی مدد سے جہادیوں کا مقابلہ کیا لیکن یہ تحریک کچلی نہیں جا سکی۔

وہابی علما کی تمام تر سعی یہ رہی کہ اسلام کو خارجی عناصر سے پاک کیا جائے لیکن وہ ہندوؤں سے اتحاد کرنے اور ان سے مدد لینے کے دل سے حامی تھے۔ ان کی رواداری اور اتحاد پسندی کا یہ اثر تھا کہ ہندو مہاجن ، ہندو راجہ - ہندو تحصیل دار - ہندو سامعین اور ہندو ترجمین سب ان کی خاموش تائید کرنے والوں میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کو ہندوؤں کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو ان کی جہادی تحریک ہگلی سے ساور تک اور سرحد سے کم نول تک نہ پھیلتی۔ اس لیے کہ مجاہدین کی تمام تر مدد ان ہی علاقوں سے گزر کر جا سکتی تھی۔

مرزا غالب کو نہ دہائیوں سے خصومت تھی اور نہ ان کے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا۔ ان کے دوستوں میں ختم العلماء مولانا فضل حق خیر آبادی بھی تھے جنہوں نے غالب کو طرز بیدل کی پیروی سے نجات دلائی۔ رام پور سے ان کا تعلق استوار کر دیا اور وہابی تحریک کی مخالفت کے ساتھ انگریزی حکومت کے بھی سخت مخالف تھے۔ انہوں نے بہادر شاہ کے لیے دستور العمل سلطنت مرتب کیا تھا جس میں گاؤ کشی کی ممانعت تھی اور ہندو مسلم اتحاد پر زور تھا۔ ان کو حکم دوام جس ہو ۱۱ اور ۱۸۶۱ء میں رنگون میں انتقال فرمایا۔

وہابی تحریک مذہبی بھی تھی، سیاسی بھی، ادبی بھی۔ اس تحریک

تھے وہ آزادی جرات اور بے باکی پیدا کی جو اس سے پہلے اردو ادب میں نہیں ملتی۔ وہابی علماء اور مرزا غالب کے راستے الگ تھے لیکن جس آزادی اور بے باکی سے ان علماء نے مذہب رسوم اور معاشرت میں تقلید کے خلاف جہاد کیا اور اصنام خیالی کو توڑا اسی آزادی سے مرزا غالب نے فن لغت اور فن شعر میں بڑے بڑے استادوں پر نکتہ چینی کی ہے اور اس بات پر زور دیا کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ وحی اور الہام نہیں ہے اور نہ ہرچرائی لکیر مراد مستقیم ہے۔

مولانا حالی اس بات پر متفق ہیں کہ سرسید میں بھی جو آزادی خیال اور جرات گرفتار ہے اس کا سرچشمہ بھی وہابی علماء کی تحریروں اور تقریریں ہیں۔

غالب کے معاصر اور حضرت شاہ عبد العزیز کی مجالس وعظ کے حاشیہ نشین مومن کو چہرہ رقیب میں سر کے بل جانے کے لیے تیار ہیں اور شب و صبح غیر کاٹنے کے لیے آمادہ لیکن جب وہ عام سطح سے بلند ہوتے ہیں تو اتنے کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کو اصل ایمان اور اپنی جان کو اس راہ میں صرف کر دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں۔ مرزا غالب کو کبھی حسرت رہی کہ وہ جہادی قافلوں میں شریک ہو سکتے اور ان کے دوش بدوش لڑ سکتے لیکن جس طرح ان کی مثنوی امتناع نظیر خاتم النبیین محض ایک ادبی لطیفہ ہے اسی طرح ممکن ہے کہ یہ آرزو بھی شاعرانہ اسلوب سے زیادہ نہ ہو لیکن اس وقت بلاشبہ پوری دلی اس تحریک سے مسور تھی اور ان وہابی مقررین اور مصنفین کی خوش گفتاریوں کے آگے بہت سے چراغ مدھم پڑ گئے تھے۔

شاہ عبد العزیز زبان دانی کے ماہر تھے۔ ان کے بھائی حضرت شاہ عبد القادر نے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا اور اس میں ”زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف“ استعمال کی ہے ”تاکہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو“

ان علماء کی کوششوں سے صاف اور سلیس زبان کا رواج ہوا جس کی بہترین شکل ہمیں ذوق و ظفر کی شاعری میں اور مرزا غالب کے خطوں اور

رقعوں میں ملتی ہے۔ نادر شاہ کا ایلچی جب دہلی آیا تو کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ کے منشیوں نے تین برس اس سوچ میں صرف کر دیے تھے کہ شاہ ایران کو کیا القاب لکھا جائے۔ اس وقت القاب و آداب مقرر تھے اور تمام اوصاف اسم تفصیل کے صیغے میں لکھے جاتے تھے لیکن جب نئی ضرورتوں کی صبح طلوع ہوئی تو یہ تکلفات بھی ختم ہو گئے۔ غالب نے جدید نثر کی طرح ڈال اور سرسید آدم نثر جدید کہلائے۔

شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز دونوں خواجہ میر درد کے شاگرد تھے ان کا تصوف انسان دوستی کے آفاق گیر تصور پر مبنی ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں تو ہندوؤں کو موجد اور صاحب کتاب سمجھتے تھے یہ غالب کے یہاں بھی ”اصل چیز عقیدے سے وفاداری ہے۔ ملتیں انہم نہیں۔ ان کے مٹنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے۔ ان کی انسانیت کے دائرے میں دیر و حرم اور زنا و بیس کا فرق موجود نہیں ہے۔ یہی نئے خطوں میں بھی ہے لکھتے ہیں: ”میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور بھائی گنتا ہوں۔“

پروفیسر گب نے لکھا کہ جب کبھی تہذیب کو کوئی خطرہ لاحق ہوا ہے تو تصوف نے اس کو اتنی توانائی بخشی ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہو سکی یہ

انیسویں صدی کو عام طور پر زوال کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی انحطاط سے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ہماری تہذیب کو ابھی گھٹن نہیں لگا تھا جہادی تحریک اور تصوف کے نئے مثبت رجحانات اس بات کے گواہ ہیں کہ اس وقت دہلی اپنی روایات سے بیگانہ اور روحانی اور اخلاقی ورثے سے بے بہرہ

نہیں تھی۔

مشکاف نے لکھا ہے کہ دہلی میں یہ شوق جہاد اتنا بڑھ گیا تھا کہ بہت سے لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی اور شہری ملازمتوں سے استعفیٰ دے دیے تھے اور اپنے گھروں سے سرکف نکل کھڑے ہوئے۔ یوں بھی اس زمانے میں علما اور ثقافت کمپنی بہادر کی ملازمت کو ”حمالی“ اور عزت و افتخار سے گرا ہوا سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز، میر تقی میر، مرزا غالب اور مومن خاں مومن — کسی نے بھی انگریز کی ملازمت قبول نہیں کی۔ شاہ غلام علی خانقاہ والے تو کہتے تھے کہ ان سب کا وسیدہ معیشت مشتبہ ہے۔ سرسید نے نذر پیش کی تو خانقاہ کے تمام مشائخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

مومن شاہ عبدالقادر کے شاگرد اور مولانا سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ ان کی شادی دہلی کے نامور خاندان ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ میر درد کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس لیے خوشامد اور تعلق سے پرہیز کرتے تھے اور قصیدہ کو کارہوس پیش گاہ سمجھتے تھے۔ وہ رند غزل خواں بھی ہیں۔ اور جہاد کے علم بردار بھی۔ عروج شہید و صدیق بھی چاہتے ہیں اور محبوب کی نگاہ بے حجاب بھی۔ وہ مثنوی جہاد یہ بھی لکھتے ہیں اور مثنوی قول غمیں بھی۔ یہ تضاد مومن ہی میں نہیں اس زمانے کی زندگی میں بھی تھا۔ وصل شاہد ان شیریں کے جو تقاضے حرم میں پورے نہیں ہو سکتے تھے وہ دیوان خانے میں پورے ہوتے تھے۔ اس دور میں ایک مناجان، ایک درگاہانی صنم، ایک رنجو، ایک صاحب جی برابر ملتی ہیں اور رندی وزہد میں وہ بیر نہیں کھتا جو آج ہے۔

غالب مومن کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کے ایک شعر پر اپنا پورا دیوان نثار کرنے کو تیار تھے۔ ان کے مرنے پر غالب نے لکھا تھا کہ

کافر باشم اگر بہ مرگ مومن
چوں کعبہ سید بلشش نہاشم عمر
سر سید نے مومن کو "یکنازہاں" لکھا ہے۔ ثواب مصطفیٰ خاں حسرتی و
شیفۃ ان کے شاگردوں میں تھے۔ اور شیفۃ کے متعلق مولانا حالی کی
رائے ہے :

"لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ ان
کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی فکر سے گرجاتا تھا اور ان کی
تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی"۔
اور خود غالب کا فتویٰ ان کے متعلق یہ تھا ہے

غالب بے فن گفتگو ناز و بد میں از زشش کر او
نوشست درد دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد
مومن کے انتقال کے بعد شیفۃ آردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مرزا غالب
سے مشورہ منہن کرتے رہے۔ دونوں میں بڑی دوستی اور محبت کے تعلقات
تھے۔ جب مرزا غالب ۱۸۴۷ء میں جوئے کے الزام میں قید ہوئے تھے تو
شیفۃ ہی نے ان کی مدد کی تھی۔ فرماتے ہیں :

خود چہاں خوں تورم از غم کہ بہ غم خواری من
رحمت حق بہ لباس بشر آمد، گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرکشش نے
بایہ، خویشتم در نظر آمد، گوئی
مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہم خواہ من است
مگر بمیرم، پہ غم از مرگ، عزادار من است

فرد کا تعلق طبقہ سے ہے اور طبقہ کا دامن اس کے سماج سے بندھا ہوا ہے۔ غالب کی اچھائیوں اور کمزوریوں کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ شاہد و شمع وے و قمار سے ان کا تعلق کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں۔ قمار بازی کے الزام میں وہ ایک دفعہ نہیں دو دفعہ معنوب ہوئے۔ ۲۲، اگست ۱۸۴۱ء کے دہلی اُردو اخبار میں لکھا ہے :

”سنا گیا ہے کہ ان دلوں تھانہ گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے مثل ہاشم علی خاں وغیرہ کے کہتے ہیں بڑا قمار ہوتا تھا۔ تھانیدار قوم سے سید..... مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ۔ نواب شمس الدین خاں قابل ولیم فرزند صاحب کے قرابت قریب میں سے ہے..... اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے۔ نداد کریں تو چار مہینہ قید“

مئی ۱۸۴۲ء کا واقعہ اسیری اس کے بعد کا ہے۔ جس کے متعلق منشی کریم الدین نے لکھا ہے :

”ان ایام میں یعنی درمیان ۱۸۴۲ء کے، ایک حادثہ ان پر جانب سرکار سے بڑا پڑا۔ جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق حال ہوا۔ عمر ان کی اس میں قریب ساٹھ برس کی ہو گئی“

لیکن ان واقعات اسیری سے غالب کی شاعرانہ عظمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ ان کی عظمت کے گوشے وہاں روشن ہوتے ہیں جہاں وہ شخصیت اور گرد و پیش سے گزر کر تاروں کو چھو لیتے ہیں اور کائنات کی دستوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ شیفہ بڑے خوش فکر شاعر تھے اور نقد شعر میں بھی امتیاز رکھتے تھے۔

ان کا تذکرہ گلشن بے خار میاں روی اور اعتدال و توازن کے لیے مشہور ہے۔ ان کو ۱۸۵۷ء میں غیر معمولی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا قیمتی کتب خانہ جل گیا۔ مکانات کو آگ لگا دی گئی اور انگریزوں نے اعانت مجرمانہ کے الزام میں ان کی جاگیر ضبط کر لی اور سات برس کی سزا دی۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں: ”مصطفیٰ خاں کا حال سنا ہو گا۔ خدا کرے مراحہ میں چھوٹ جائے ورنہ جس ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں“

شیفۃ خوش قسمتی سے اپیل میں بری ہو گئے۔ غالب جن کی کوششوں سے شیفۃ کو رہائی ملی تھی ان سے ملنے میرٹھ گئے۔ جائیداد کی واگزاروں میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ شیفۃ صبر و رضا کی دولت خاص سے بہرہ مند تھے۔ مالک رام صاحب نے ان کے منبٹ و استقلال کے دو عجیب واقعات لکھے ہیں۔ جس زمانہ میں وہ قید میں تھے، پایادہ، بیڑی پہننے ایک سڑک سے گزر رہے تھے اس وقت آسمان کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے: ”تیری شان کریمی کے قربان۔ اتنی ہی سزا دی، ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا“

دوسرا واقعہ انھوں نے منشی ذکار اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ شیفۃ کو سلطان ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے عمل جراحی تجویز کیا۔ وہ آتا اور ناقص گوشت کاٹ کاٹ کے الگ کر دیتا۔ دیکھنے والوں کے دل ہل جاتے لیکن ان کے ہاتھ پر شکن تک نہ آتی۔ ایک دن بڑے صاحبزادے محمد علی خاں بے اختیار رونے لگے تو فرمایا ”اس جسم خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی ہے“

مفتی صدر الدین آزاد نے جو خود ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں چند در چند مصائب کا شکار ہوئے تھے، اپنے مرثیہ دہلی میں شیفۃ اور صہبائی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ثانی الذکر کے جسم کو توپ سے باندھ کر ان کے پرچے اڑا

دیے گئے تھے۔ آزرده لکھتے ہیں ے

روز و حشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر پہ اور جوش جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
مکڑے ہوتا ہے جگر، جی ہی پہ بن آتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزرده نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

غالب اور سرسید کے دوست فاضل عمر مولانا امام بخش صہبائی دلی کالج
میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ بغاوت کے الزام میں ان کی جو دردناک موت
واقع ہوئی اس پر سفینہ رحمانی میں جو مرثیہ کے اشعار درج ہیں ان کو پڑھ کر
آج بھی درد کی ایک ٹیس پیدا ہو جاتی ہے ے

ندائیم کجارت اُس نقش پاک ملک بردیا ماند بروئے خاک
ندائیم کے داد اور آشفن ویا ماند چوں سایہ برخاک تن
بخاکش نمودند اورا نہاں ویا مرتفع شد سوی آسماں
کے فاتح ہم بروخواندہ است لبطر گلابی بر افشانده است
الہی بیا مرز مظلوم را کلاہ شہی دہ بہ ملک بقا

مفتی صدر الدین آزرده فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے
زبردست عالم تھے۔ جرم بغاوت میں بقول غالب ”بہت دیر حوالات میں رہے۔
کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ رو بکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے
جاں بخش کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائیداد ضبط۔ لیفٹیننٹ گورنر نے ازراہ
ترجمہ نصف جائیداد و اگر اشت کی“

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے ”مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا گرمی برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا یہاں

اس زمانے میں اکثر مشاعرے ہوتے اور ان میں فارسی آرد و غزلیں پڑھی جاتیں۔ غالب سب میں تو نہ جاتے لیکن جن مشاعروں کا انتظام نواب ضیاء الدین خاں کرتے ان میں اصرار سے چلے جاتے۔ انھوں نے ایک قصیدہ عرفی کے طرز میں اور گریستن کی ردیف اور جناب سید الشہداء کی منفیت میں لکھا تھا۔ اس مشاعرہ میں نہ مثنوی تھی اور نہ صہبائی۔ مرزا کو تامل رہا کہ فارسی کا قصیدہ ہے پڑھیں نہ پڑھیں بلکہ ”ورنچہ گویاں را در دسرند ہم“ اتفاق سے مفتی صدر الدین آئندہ آگئے۔ غالب لکھتے ہیں: ”از آمدن حضرت آزرده دل بخود بالیدوز منزہ دستور ی یافت“ مولانا حالی کا بیان ہے کہ مرزا کی پُر درد آواز سے مجلس مشاعرہ مجلس عزابن گئی اور جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ براہم روتے رہے۔ اتفاق سے سینھ پر سنے لگا۔ مفتی صاحب نے فرمایا ”اُساں ہم گریست“ یہ صحبتیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں درہم برہم ہو گئیں اور دلی بیواؤں سے زیادہ دکھائی ہو گئی ہے

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تہمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اک شور تھا، غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں

بتانا باغیاں رو رہی ہاں غنچہ یہاں گل تھا

جس زمانے میں مرزا غالب دہلی آئے ہیں یہاں انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا اور گوشہ میں نفس کے کچھ آرام اور اطمینان بھی تھا۔ تہذیبی زندگی کا شیرازہ جو منتشر ہو گیا تھا، وہ ایک دفعہ پھر بندھ گیا تھا اور اسی کے نتیجے میں وہ رہ نما میسر آئے جنہوں نے عہد جدید کی گزر گاہوں کو ردِ شن کر دیا اور ہمیں ایک نئی سادہ زبان، ایک نیا ادب، نئے اصول نقد، ایک نیا نظام تعلیم اور مذہب اور تہذیب کی مدافعت کے نئے ہتھیار دیے۔ ہم نے مغرب کے آگے فوراً سپر نہیں ڈال دی بلکہ آویزش اور پیکار سے لے کر افہام و تفہیم اور مفاہمت و مصالحت کی تمام منزلیں طے کیں۔ یہ غلط فہمی عام ہے کہ انیسویں صدی میں ہندوستان علم و فن سے بیکار نہ تھا اور اس پر زوال اور تکیہ کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن یہ پوری صداقت نہیں ہے۔ کرنل سلیم نے لکھا ہے:

” دنیا میں ایسی قومیں کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ یہاں سات سال کے درس کے بعد طالب علم کے دستارِ فضیلت باندھی جاتی ہے اور وہ اسی طرح سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا کے متعلق گفتگو کر سکتا ہے جس طرح آکسفورڈ کا ایک طالب علم“

مرزا غالب کی دہلی میں علما میں شاہ عبدالعزیز اور مولانا فضل حق خیر آبادی اطباء میں حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں اور شعرا میں مومن و شفیقہ اور ذوق و ظفر موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک کی حیثیت فرد کی نہیں ادارے کی تھی۔

غالب بھی اس عہد کے صاحبِ نظر دانشوروں میں تھے۔ وہ اگرہ کے خم کدہ نیاز سے نکل کر دلی آئے تو یہاں شاعرِ دہلی سے معرکہ آرا ہوئے

انہوں نے ذوق کی سانی تحریک کو مانا لیکن اسے حکیمانہ نظر بھی دی۔ کھلتے گئے تو وہاں حایان قتیل سے برسرِ پیکار ہوئے اور اس ایرانی ہندی نزاع میں کود پڑے۔ جو فیضی اور عرفی شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے زمانے سے جاری تھی۔ مرزا نے اس میں بھی سرگرم حصہ لیا اور بعض ایرانیوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ پھر ان کی پیشن کا قصہ اٹھ کھڑا ہوا جس میں وہ پورے تیس برس تک الجھے رہے۔ انہوں نے انگریزوں کی خدمت میں قید دے بھیجے جو دراصل منظوم عرضیاں ہیں اور ان کو اس زمانے کے مروج طریقوں ہی کی نظر سے دیکھنا چاہیے یہاں بھی سوال شناسا گوئی اور مدح گستری یا جیغ و سرپیچ اور مالائے مروارید سے زیادہ خاندانی حق اور وجاہت کا تھا جس کو وہ کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مرنے کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی آجائے اور شاہی خاندان کو قطب میں منتقل کر دیا جائے لیکن اکبر شاہ اپنے موروثی حقوق پر اڑے رہے۔ ۱۸۱۲ء میں جب گورنر جنرل کھلتے سے دہلی آئے تو بادشاہ نے ان کو اپنے قریب کر سی دینے سے انکار کر دیا اور پھر آداب و نیاز کا یہ سلسلہ ہی منقطع ہو گیا۔

۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہو گیا اور ان کے بعد بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ اس وقت ان کا عمر ساٹھ برس کی تھی لیکن وہ انگریزوں کی نظر میں بڑی طرح کھٹکتے تھے۔ انہوں نے باوجود بے بسی اور پیرائے سالی کے بھی کچی شاہی عظمت کو قائم رکھا اور اس پر آنے نہیں آنے دی۔ انہوں نے اس پر اصرار کیا کہ انگریز جو تہ اتار کر ان کے حضور میں حاضر ہوں لیکن انگریز ان پر طرح طرح کے ظلم کرنے پر تھے ہونے تھے اور ان کی معاشی حالت کو کمزور کرنے کے درپے تھے۔ لارڈ ایلن برارڈ

نے عیدین - نوروز اور سالگرہ کے موقع پر نذر پیش کرنا بند کر دی۔ ۱۸۴۸ء میں لارڈ ڈلہوزی دہلی آیا اور مارے غرور کے بادشاہ کے حضور میں سلام کو حاضر نہیں ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں زبردستی یہ طے ہوا کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد جو بھی تخت نشین ہو گا وہ لال قلعہ میں نہیں رہے گا۔ اس کو بادشاہ کے بجائے شہزادہ کے لقب سے یاد کیا جائے گا اور وہ پندرہ ہزار روپے ماہوار کی معمولی پنشن کے ساتھ قطب صاحب میں زندگی بسر کرے گا لیکن ایک ہی سال کے اندر بغاوت ہوئی و اس دفتر اسکا و خور و کا ورا اقصا ب برد

مرزا غالب کی شادی ذوق کے شاگرد نواب الہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوئی تھی جن کے تعلقات دہلی کے نامور شاعروں اور امیروں سے بہت گہرے تھے۔ غالب کو بھی ان محفلوں میں درخور حاصل ہوا اور وہ ان صحبتوں سے پوری طرح فیض یاب ہوئے۔ ذوق کا سکہ صرف معروف ہی کے یہاں نہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی چل رہا تھا۔ غالب کے کلام میں جو سہل ممتنع کا رجحان اور زبان و بیان کے کمرشموں کی طرف توجہ ملتی ہے وہ بھی اسی دبستان کا اثر ہے۔

۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ ظفر نے حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات دیے اور پچاس روپے ماہوار پر شامان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت سپرد کی۔

۱۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو استاد شہ خا قانی ہند ذوق کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی ان کے سپرد ہوئی لیکن ملک الشعرا یا اس طرح کا کوئی خطاب نہیں ملا۔ ظفر و غالب کے انداز و اسلوب میں بڑا فرق ہے اور وہ ان دونوں کے دیوانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ بہادر شاہ کا سہارا بہت کمزور تھا۔ یہ چہرہ رخ معلوم نہیں کب بجھ جائے۔ ۱۸۵۲ء میں بہادر شاہ بیمار ہوئے۔ اس وقت غالب کو اپنے مستقبل کی

طرف سے فکر ہوئی اور انھوں نے منشی ہیرا سنگھ کو لکھا:
 "از شبِ حید خاقان رنجور است۔ حال دیگر چہ رونماید و بمن کہ
 در سایہ دیوارش غنودہ ام، چہ رود؟"

۱۸۵۷ء کو بغاوت شروع ہو گئی اور اس کے شعلوں نے دہلی اور
 پورے اکناف ہند کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے "یوں تو غالب کے الم نامہ جیات
 کا کوئی ورق بھی ایسا نہیں جس کے بین السطور کی آرائش میں دل و جگر کا
 خون بے دریغ صرف نہ کیا گیا ہو لیکن اس جلیل القدر انسان کے اندوہ و
 ماتم کا سب سے بڑھ کر دردِ ناک بابِ سلطنتِ تیموریہ کے زوال کا وہ خون
 چمکاں واقعہ ہے جو عام طور پر "غدر" کے نام سے معروف ہے۔" لے

غالب نے اس تہذیب کا مرنے پر بڑے پردرد الفاظ میں پیش کیا ہے
 اور رمزی علامتوں کے پیرایہ میں ساری خارجی حقیقتوں کو سمویا ہے۔

یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط

دامان باغبان و کف گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی دذوقِ صدا ئے چنگ

یہ جنت نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے اکہ تو بزم میں

نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی تھی سودہ بھی خاموش ہے

۱۸۵۷ء کی بغاوت پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ایک اچھا خاصہ کتب خانہ

تیار ہو سکتا ہے لیکن اس دہلی کے حالات کا بہترین ماخذ غالب کا روزنامہ
دستنبو، ان کے خطوط اور وہ اشعار ہیں جن میں ان کے دل کی تمام دھڑکنیں
سنی جاسکتی ہیں۔

غالب نے دستنبو میں انسانی نقطہ نظر کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے انگریزوں
پر جو مظالم ہوئے ان کو بیان کیا ہے اور لکھا ہے، ”بیچ مشمت خاک کے نمائد کہ از
خون گل اند اماں از خواں زار نشاء، لیکن اسی کے ساتھ باغی دوستوں اور شکستہ
خوردہ امیروں کی تکلیفوں سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔ غالب کی مجبوریوں کے پیش
نظر اس روزنامے کو بین السطور میں بڑھنا چاہیے۔ اس لیے کہ غالب نے جابجا
صنعت طرازی سے کام لیا ہے اور عبارت کی تہوں میں اپنے مطالب کو چھپایا ہے۔
دستنبو کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں
عوام شریک تھے اور یہ صرف فوجیوں کا برپا کیا ہوا ہنگامہ و آشوب نہیں
تھا۔ عوام نے آخری وقت تک دلیرانہ اور مدافعتانہ جدوجہد کی اور اجمیری دروازہ
اور ترکمان دروازہ یہ سب رزم گاہ میں تبدیل ہو گئے تھے۔ دہلی اب شہر
نموشاں میں تبدیل ہو گیا تھا اور پوری مسلمان آبادی شہر بدر کر دی گئی تھی، شہر از
مسلمانان تہی است شبانہ خانہ لے ایں مردم، بے چراغ اور روزانہ، روزن دیولم
بے دود“

دستنبو لکھنے کا مقصد اپنی بے گناہی ثابت کرنا اور خلعت و خطاب اور پنشن
کی درخواست کرنا تھا۔ پھر بھی اس کا ایک بڑا حصہ ان تکالیف کے بیان پر مشتمل
ہے جو فتح دہلی کے بعد مرزا غالب اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو پیش آئیں
اور جن کو انھوں نے بڑے پرسوز انداز میں قلم بند کیا ہے۔ غالب نے آئینہ کو
ایک خاص رخ سے پکڑا ہے اور پہلی دفعہ ہندوستانیوں کے مصائب کو
غیر ملکی حکمرانوں کے سامنے رکھا ہے۔

غالب اس قدر کے ہنگامہ میں مع زن و فرزند، قلم زم خون کے شنوار

رہے اور انھوں نے دروازہ سے باہر قدم نہیں رکھا لیکن یہ اتنا بڑا انقلاب تھا کہ اس کے بیان کرنے کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں۔ مردوں تو کوئی خزاوار نہیں!“
مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

”صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے اور ہمارے تمہارے دلی دوست تھے منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا۔ نہ وہ اشخاص۔ نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط۔ نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا اس کا جواب آیا۔ ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی اور اس محلے کا نام بلی ماران کا محلہ لیکن ایک دوست، اس جنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا۔“

مرزا غالب نے اپنے خطوں میں بار بار اور بالآخر اپنی بے گناہی اور باغیوں سے بے تعلقی ظاہر کی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ دربار میں حاضر

ہوتے تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ کی خدمت میں سکہ شعر بھی پیش کیا تھا۔ اور فرخ انگرہ کی خوشی میں ایک قصیدہ بھی پڑھا تھا۔ اس لیے ان کی یہ گناہی کو بعض نئی شہادتوں کی روشنی میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ غالب نے حسین مرزا کو جون ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھا ہے:

”یہاں ایک اخبار جو گوری شنکریا گوری دیال یا کوئی اور، غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی فلاتی تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرا ناہ

بہ زرد سکہ کشورستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی مجھ سے عند الملاقات صاحب کشن نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے میں نے کہا کہ غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر۔ بادشاہ کے بیٹے شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔“

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

”میں نے سکہ کہا نہیں۔ اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا یہ گناہ نہیں اور گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملک معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرع معاف نہ ہوں۔“

سوال یہ ہے کہ غالب کے وہ مصرعے کون سے تھے۔ تھے بھی یا نہیں بہادر خیال ہے کہ جو سکے غالب سے منسوب کیے گئے وہ درحقیقت ان کے نہیں تھے اور اس معاملے میں ان کا اضطراب بجا تھا۔ لیکن انھوں نے سکہ بھی کہا تھا اور قصیدہ بھی گزراتا تھا۔ اس طرح باغیوں سے اخلاص کی بات بالکل نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

غالب کا سکہ منشی جیون لال نے پیش کیا ہے۔ اس روز ناچہ کا انگریزی ترجمہ

مٹکاف نے کیا تھا اور سخن فہمی، عالم بالا کا حال یہ ہے کہ سکہ شعر کا ترجمہ اشرفی کیا ہے اور اس انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ غدر کی صبح و شام میں موجود ہے لیکن مٹکاف کا ترجمہ غلط ہے اور اردو ترجمہ غلط در غلط ہے جس اتفاق سے میں نے انگلستان کے قیام میں جیون لال کے اصل اردو روزنامہ سے استفادہ کیا ہے۔ اس میں انیسویں مئی، ۱۸۵۷ء کے ذیل میں جیون لال نے لکھا ہے:

”دربار شاہی منعقد ہوا۔ مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہو کر ایک سکہ جلوس دربارت تحت نشینی حضور گزارنا۔ اس پر اور شاعروں نے بھی سکے کہے۔“

تین سکے لکھنے کے بعد جیون لال نے مرزا غالب کا یہ شعر، سکہ شعر مرزا نوشہ کے عنوان سے پیش کیا ہے جو خود پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

بمرد آفتاب و لقرہ ماہ

سکہ زرد در جہاں بہادر شاہ

غالب نے ایک قصیدہ بھی، ۱۸۵۷ء کی بغادت کے زمانے میں اور فتح آگرہ کی خوشی کے موقع پر پیش کیا تھا۔ منشی جیون لال نے ۱۳ جولائی، ۱۸۵۷ء کے ذیل میں لکھا ہے:

”فتح آگرہ کے مزدے سے سب بادشاہ اور اہل قلعہ خوش تھے

مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ایک قصیدہ من تصنیف خود بادشاہ

کی طرح میں پڑھے“

جیون لال کے اس بیان کی تائید آگرہ کے اخبار عالم تاب سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

”مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ۱۳ جولائی، ۱۸۵۷ء کے دن بہادر

شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے عوامی بغاوت کے زمانہ میں بہادر شاہ ظفر سے تعلقات منقطع نہیں کیے تھے۔ اس سے ان کی غیرت قومی اور بادشاہ کی ہر دل عزیزی دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔
 نے لکھا ہے کہ ملک میں ہر شخص بادشاہ کی غیر معمولی عزت اور احترام کرتا ہے اور ہندوستان کے تمام لوگ ان کو اپنا جائز آقا اور فرماں روا سمجھتے ہیں۔

اور واقعہ بھی یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے انگریزوں سے لڑائی ضرور لڑی تھی لیکن نہ کوئی بد عہدی کی تھی اور نہ کوئی غداری اور بغاوت کی تھی۔ اس نے تو صرف اس حق پر اصرار کیا تھا جو اس کو گیارہ پشتوں سے ملتا چلا آیا تھا۔ انگریزوں نے جو اس پر دلیوان خاص میں ۲۲ دن تک مقدمہ چلایا وہ بھی صریحاً بے انصافی تھی اور قید و بند میں جو مظالم کیے وہ بھی کسی طرح معاف نہیں کیے جاسکتے۔ رنگون میں قید تہائی تھی کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ جب بیماری بہت بڑھی تو حکیم کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ دفن کے بعد گوروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھوڑوں سے قبر کو اس طرح زمین کے برابر کر دیں کہ نام و نشان تک باقی نہ رہے انہوں نے اس کی خود پیش گوئی کی تھی۔

پس مرگ، قبر پر اے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
 وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشان او سے ٹھوکروں سے اڑا دیا
 انگریزوں نے اس بات سے بھی ممانعت کر دی تھی کہ نہ کوئی قبر پر جائے اور نہ فاتحہ پڑھے۔ مرحوم بادشاہ نے ایک شعر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا تھا غنائے ہیں۔

کوئی آکے پھول چڑھائے کیوں کیوں آکے شمع جلائے کیوں
 کوئی بہر فاتحہ آئے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

غالب نے بہادر شاہ کی وفات کا ذکر ان الفاظ میں کیلہ ہے :

” ۷ نومبر ۱۸۵۷ء مطابق ۱۴ جمادی الاول سال حال، جمعہ کے دن
ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ اور قید جسم دونوں سے آزاد
ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا رَاجِعُوْنَ“

کہنے کو یہ چند لفظ ہیں لیکن ان کے پیچھے درد ہی درد ہے۔ یاس ہی یاس ہے۔
دل تاجگر کے ساحل دریا تے خوں ہے اب

بغاوت کے زمانے میں جب بریلی حکم نافذ تھا۔ غالب کے بھائی مرزا یوسف
کو انگریزوں نے گولی مار کے ہلاک کر دیا۔ ہمیں یہ اطلاع معین الدین حسن خاں کے
روزنامے سے ملی ہے جو شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکا
ہے لیکن غالب نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ انگریزوں کی گولی سے ہلاک ہوئے۔
انہوں نے دستنبویں صرف یہ لکھا ہے :

” ۱۸ اکتوبر کو پیر کے دن وہ کم بخت دربان بھائی کے مرنے کی خوشخبری

لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہ فنا (یعنی یوسف مرزا) پا پن دن تیز
بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت
ہو گیا۔ پانی۔ غسل۔ رو مال۔ گورکن۔ اینٹ۔ چونے۔ گارے
وغیرہ کا ذکر چھوڑ دیتے۔ یہ بتاتے کہ میں کیسے جاؤں اور میت کو کہاں
لے جاؤں کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔ بازار میں اچھا
بڑا۔ کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی
شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے
لے جا کر جلا سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ دو تین
شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں چڑ جائے کر میت کو شہر سے
باہر لے جائیں۔

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور اس کام کو انجام دینے

کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیاے کے ایک سپاہی کو اچھے کیا۔ میرے دونوں کوں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا۔ دو تین سفید چادریں اس گھر سے لے گئے۔ ان میں پیٹا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی۔ زمین کھودی۔ میت کو اس میں رکھا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔“

۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا لیکن یہ تاریخ کی بڑی ہولناک لڑائی تھی۔ اہل دہلی نے بڑی ہمت اور بہادری سے ایک ایک انچ کے لیے جان دی۔ اور پورا شہر رزم گاہ میں تبدیل ہو گیا۔ ہڈیوں نے لکھا ہے کہ ہم ان بد معاشوں کا صحیح نشانہ مارنے اور توپوں کے تیز چلانے میں مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ فتح کے بعد قتل عام شروع ہو گیا۔ ہر مسلمان کو باغی قرار دیا گیا اور پوری آبادی شہر سے نکال دی گئی۔ یہ تجویز بھی تھی کہ سارے شہر کو تہ خاک اور جامع مسجد کو مسمار کر دیا جائے تاکہ بقول اوگرم مسلمانوں کو عبرت ہو اور ان کے مذہب کی تذلیل ہو۔ یہ بھی تجویز تھی کہ فتح پوری کی مسجد میں فوج کو ٹھہرایا جائے اور زینت المساجد میں ایک بڑا تنور خانہ قائم کر دیا جائے۔ اس وقت غالب پر جو چراغ صبح کی مانند تھے کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ ناممکن ہے۔ ایک دو فرختم ہو گیا تھا اور دوسرا شروع ہوا تھا جو پہلے سے قطعی مختلف اور معاندانہ تھا۔ غالب نے دستبنو میں لکھا ہے:-

”جن کو پھانسی دی گئی ہے ان کی تعداد فرشتہ موت ہی جانتا

ہے۔“

محض پھانسی ہی نہیں دی گئی بلکہ بعضوں کی کھال کھینچ لی گئی، بعض کو زندہ جلا دیا گیا۔ بعض کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ بعض کو قید میں سڑا دیا گیا۔ غرض انگریزوں کے انتقامی مظالم سے ”جان و مال و ناموس و مکان و مکس و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔“

غالب، بیگمات قلعہ کے متعلق لکھتے ہیں :
 ”تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ
 دو ہفتہ کی سی۔ کپڑے میلے۔ پاتھیر لیر لیر جوتیاں ٹوٹی۔“
 اپنے متعلق لکھتے ہیں : ۴

تو بے کسی وغریبی ترا کہ می پر سر
 ”نہ جزا۔ نہ سزا۔ نہ نفوس۔ نہ آفریں۔ نہ عدل۔ نہ ظلم۔ نہ لطف۔
 نہ قہر۔“

میرا براہیم علی خاں سورتی لکھتے ہیں :
 ”خداوند نعمت کیا تم دہلی کو آباد سمجھتے ہو..... کالے صاحب کا
 گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی ہو۔ کاغذ کا پرزہ ،
 سونے کا تار۔ پشمینہ کا بال باقی نہیں رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں
 آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اب ایک
 جنگل ہے اور میداں میں قبر۔“
 یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

”میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زنداں کے
 فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ وتار ہے۔ یہاں افیاد امرا کے
 اولاد و ازدواج بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔“
 دہلی کی بربادی سے متعلق میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :
 ”مسجد جامع سے راج گھاٹ تک بے مبالغہ ایک صحرائے ق و دق
 ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو بڑے ہیں اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو
 جائے۔“

اس خط میں لکھا ہے :
 ”واللہ دلی اب شہر نہیں۔ کیپ ہے چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر۔“

نہ بازار نہ نہر“

۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو چند گورے غالب کے مکان میں گھس آئے اور ان کو گرفتار کر کے کرنل براؤن کے سامنے لے گئے اس وقت کسی مسلمان کو شہر میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ کرنل براؤن نے پوچھا ”تم مسلمان ہو“ مرزا نے کہا۔ اُدھا۔ فرمایا کیا مطلب؟ کہنے لگے شراب پیتا ہوں سو نہیں کھاتا۔“

یہ گرفتاری اور باز پرس معمولی بات نہیں تھی۔ دلی کے احکام، قضا و قدر کے احکام تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور نقشِ جاہِ نظر نہیں آتا تھا لیکن انھوں نے اس پل صراط پر بھی۔ ظرافت کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہمیں ظلمت کے برداشت کرنے کا اہل بنایا۔ اس شکست اور اضطراب کے زمانے میں جب موجِ خون ہمارے سرے گزر رہی تھی۔ انھوں نے ہمیں ایک حوصلہ اور بہمت عطا کی۔ یہ قصا ما دی ترقیوں کے لیے سازگار نہیں تھی۔ اب سرشکری کا موقع نہیں تھا۔ صرف سخنِ گسری کا موقع تھا۔ وہ خود کہتے ہیں۔ اُتین زد و دوں صورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است۔ یہی وجہ ہے کہ تورانیوں کا علم ان کے قلم میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس قلم میں تلوار کی سی تیز روشنی اور برش ہے۔ اسی طرح ان کی ظرافت میں وہ شوخ اور ذہین ذہانت اور دیدہ وری ہے جو پیکرِ الفاظ میں روحِ پھونک دیتی ہے۔ ایک فلسفیانہ بے نیازی ہے۔ کلیت اور مرثیت نہیں۔

قدر کے بعد غالب کے سارے ذرائع آمدنی مسدود ہو گئے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ۵۳ برس کا پنشن۔ تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ ایک و بہ متلوری گورنمنٹ۔ اور پھر نہ ملا ہے۔ نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔ علی کا بندہ ہوں۔ قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں قرض کی امید ہے۔ نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔

غالب نے مجبور ہو کر انگریز حکام کو پنشن کی بازیاں کے لیے لکھا۔ قصیدے نظم کے۔ عرضیاں بھیجیں اور ۱۸۶۰ء میں جا کر پنشن کا کچھ روپیہ وصول بھی ہوا۔

رام پور کی سرکار نے بھی سو روپے ماہوار مقرر کر دیے تھے لیکن ان مواقع پر غالب کو خالصے خوش آمدان خطوط لکھنے پڑے اور بندگی میں بھلا نہ ہونا عجب اور معبود کے لیے شرمناک ہے۔

غدر کے بعد غالب ایک عرصہ تک پنشن خلعت و خطاب اور دربار ولبر کے قیفے میں گرفتار رہے۔ جب ان الجھنوں سے کچھ نجات ملی تو وہ عوارض فساد خون میں مبتلا ہو گئے اور پھوٹوں کی کثرت سے سرو خراغاں ہو گیا اور طاقت نے جواب دے دیا۔ وہ جون ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں..... روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر نفس میں۔ کوئی شغل۔ کوئی اختلاط۔ کوئی جلسہ۔ کوئی مجمع۔ پسند نہیں کتاب سے نفرت۔ شعر سے نفرت۔ جسم سے نفرت۔ روح سے نفرت۔ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

خرم آں روز کزیں منزلی ویراں بردم“
آخر عمر میں مرزا غالب کو مالی دشواریوں اور مسلسل بیماریوں نے زندہ درگور کر دیا تھا لیکن اس حیوان ظریف کی بدلتہ سبکی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مرنے سے ایک دن پہلے نواب علاؤ الدین لوہارو نے حال پوچھا تھا۔ انہیں جواب دیا۔ ”میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک ادھر روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے“
غالب نے کبھی مصائب کے آگے ہار نہیں مانی اور وہ ہر حال میں پُر امید رہے۔ ان کی انسان دوستی۔ ان کی دردمندی۔ ان کی فراخ دلی۔ ان کی دیدہ وری۔ ان کی سنجیدہ ظرافت اور ان کی شگفتہ متانت ہماری تہذیب کا بہترین سرمایہ اور ان کی شخصیت ہمارے ادب کی سب سے دل کش اور قد آور

شخصیت ہے۔

قمریاں یاس غلط کردہ خود می دارند

ورنہ بیچ سرو دریں بارغ باند ام تو نیست

ان کی یہ غزل لکچروں کا اختتام ہے عہد جدید کا اعلان اور صبح عید کی نوید ہے۔ انھوں نے نئے زمانے کی اور نئی قدروں کی اس وقت تائید کی اور صبح کی بشارت دی جب سرسید اور رام چندر کو بھی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے میں ان کے اشعار کو پڑھوں گا بعد میں ترجمہ کروں گا:

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند
رخ کثودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل رلودند و دو چشم نگہ انم دادند
سوخت آتش کدہ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بت خانہ ز ناقوس فغانم دادند
گہرا ز رایت شاہان عجم برچیدند
بعومن جامعہ گنجینہ فشانم دادند
افسرا ز تارک ترکان پشنگی بردند
یہ سخن ناہیہ فر کیا نم دادند
گو ہرا ز تاج گستند و بدانش بستند
ہرچہ بردند یہ پیدا یہ نہا نم دادند

انھوں نے مجھے اندھیری رات کے اندھیرے میں صبح ہونے کی خوش خبری دی۔ انھوں نے شمع بجھا دی اور سورج کے طلوع ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ جب آتش جل کر راکھ ہو گیا تو مجھے

آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی۔ اور جیب بت خانہ گھر گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دے دی۔ شاہانِ عجم کے جھنڈوں کے موتی اتار لیے اور اس کے عوض میں مجھے خاتمہ گنجینہ فشاں عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج ٹوٹ لیا اور مجھ کو شاعری میں اقبال کیانی مرحمت فرمایا۔ تاج میں سے موتی توڑ لیے ان کو علم و دانش میں جڑ دیا۔ یعنی جو کچھ علی الاعلان ٹوٹا تھا وہ مجھے چپکے سے دے دیا۔

